



مضامین سرسیّد

از

عزیزالدین اختر ادیب فاضل (پنجاب)

مع تبصرہ

از

نسیم قریشی ایم اے۔ بی اے آنرز

پبلشرز:- کتاب گھر

مسلم ایجوکیشنل پریس علی گڑھ

قیمت عہ
۱۵ /

مطبوعہ
مسلم ایجوکیشنل پریس علی گڑھ



فہرست مضامین

سرسید کی شخصیت ذہن و فکر اور ادبی کارنامے
کا
اک جائزہ

سرسید | جدید ہندوستان کے معماروں میں سرسید احمد خاں
اک ممتاز حیثیت رکھتے ہیں۔ وہ ایک زبردست
ریفارمر تھے، جن کی کاوشوں نے ہندوستان کی موجودہ تاریخ
کو بہت متاثر کیا ہے۔ ۱۸۵۷ء ہماری ملکی زندگی میں ایک
انقلاب آفریں واقعہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ ہندوستان میں مسلمانوں
کی آمد کے وقت سے ہندو مسلم میل جول، اور رابطہ و اتحاد سے
جو تہذیب، تمدن اور ادب پیدا ہوا۔ اور خاص طور پر مغلوں کے
دور میں جسے بننے، سنورنے، پروان چڑھنے کا موقع ملا ۱۸۵۷ء
کے واقعے نے اس کی رفتار میں ایک زبردست تغیر پیدا کر دیا۔
دو سو برس پہلے یوروپی تاجروں کے جو قافلے، تجارت کی غرض
سے ہندوستان آئے تھے، انھوں نے اپنی ذہانت، حسن تنظیم بہتر

فوجی مہارت اور زندگی کے نئے تصورات کے بل بوتے پر اپنی پوزیشن کس قدر مستحکم کرلی کہ ہندستان کے راجاؤں، اور نوابوں کی حکومتیں اُن کے ہاتھ کا کھلونا بن گئیں۔ اور ۱۸۵۷ء کے انقلاب نے مغلیہ سلطنت کا آخری نشان، ہندستان کی زمین سے مٹادیا اور زندگی اور تہذیب کے اُس تصور کو زبردست ٹھیس لگی جو صدیوں کی کاوشوں سے پروان چڑھا تھا۔

یہ سوال خاص طور پر غور طلب ہے کہ ہندستان میں انگریزی حکومت کے قیام کے نتیجہ میں ملک کی زندگی پر جو نتائج مرتب ہوئے، وہ ہندستان کے لئے مفید ہیں یا مضر؟ جذباتی انداز فیصلہ سے قطع نظر، خالص عقلی طور پر، ہر صاحب فہم یہ ماننے پر مجبور ہے کہ انگریزی حکومت کے اثرات کو نہ تمامتر مفید کہا جاسکتا ہے، نہ تمامتر مضر ——— ! "خیر آمیز شر" کی اصطلاح سے صحیح طور پر ان اثرات کا تعین ہو سکتا ہے۔ انگریزی حکومت نے ہندستانیوں سے سیاسی وقار چھینا، قومی خودداری چھینی، پورے ملک کو کچے مال کی منڈی بنا کر رکھ دیا، اس میں کوئی کلام نہیں کہ یہ نمایاں مضر اثرات ہیں جو اس حکومت کے قیام سے پیدا ہوئے۔ لیکن ساتھ ساتھ اس پر بھی نگاہ کرنی پڑے گی کہ انگریزوں کے زیر اثر ہندستانیوں کو نئے علوم سے آشنا ہونے کا موقعہ ملا سیاسی تنظیم کے نئے نقشے اُن کی نگاہوں کے سامنے آئے۔ ہندستانی ادیب جو

زوال کے دور میں زندگی کے دھاروں سے کٹ کر نشاط و تفریح کی جنتِ خیال بن گیا تھا، زندگی سے زیادہ قریب آیا اُس میں نظر، حوصلہ اور توانائی پیدا ہوئی۔ اور یہ صلاحیت ابھری کہ وہ نئے حالات میں زندگی کی رہنمائی ہمت اور صلاحیت کے ساتھ انجام دے سکے۔

ہندستانی زندگی کو بدلے ہوئے حالات میں نئے طرز سے آشنا کرنے اور مسلسل اصلاحی عمل سے نئے رنگ روپ پیدا کرنے کا سہرا اُن مصلحوں کے سر بندھتا ہے جن کا سلسلہ بنگال کے مشہور بیدار مغز ریفارمر راجہ رام موہن رائے سے شروع ہوا۔ ان محترم بزرگوں نے تعصّب اور تنگ نظری کے بندھنوں کو توڑا، کھلی ہوئی آنکھوں سے نئی دنیا کو دیکھا، زمانے کے نئے تقاضوں کو پہچانا، اپنے ملک کی ابتری، زوال اور پریشان حالی کے اسباب کے کھوج لگانے کی کوشش کی۔ اور ہمت اور حوصلے کے ساتھ زندگی کی نئی روش اختیار کرنے کے لئے مسلسل تبلیغ کی۔ گویا حالی کے الفاظ میں انھوں نے پوری ہندستانی قوم کو یہ کہہ کر پکارا کہ "چلو اس طرف کو ہوا ہو جدھر کی"۔ مسلمانوں کے دائرے میں نئے طرز کے اصلاحی کام کا بیڑا سر سیّد احمد خاں نے اُٹھایا۔ اور جدید ہندستان کی تاریخ میں یہی اُن کا امتیاز ہے

سر سیّد کی زندگی

سر سیّد دہلی کے ایک باوقار خاندانی سادات کے فرد تھے، ان کے بزرگ علم، تصوّف، انتظام حکومت، غرض شہرت و ناموری کے مختلف میدانوں میں امتیاز اور کمال حاصل کر چکے تھے۔ سر سیّد ۱۷ اکتوبر ۱۸۱۷ء کو دہلی میں پیدا ہوئے۔ اُن کے والد سید متقی جن کا سلسلہ نسب ۳۵ پینتیس واسطوں سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچتا ہے بادشاہِ وقت کے مقرب تھے۔ اور اُن کے نانا دبیر الدولہ امین الملک خواجہ فرید الدین احمد خاں، علم و فضل میں نمایاں شہرت رکھتے تھے۔ خصوصاً ریاضی (میتھمیٹکس) میں اُن کا درجہ مسلّم ہے۔ سر سیّد نے جس ماحول میں آنکھیں کھولیں، وہ بہت ستھرا علمی اور مذہبی ماحول تھا اُن کی تربیت اور پرداخت میں اُن کی والدہ کا ہاتھ بہت نمایاں رہا ہے۔ وہ ایک بہت سچی دیندار، خدا ترس اور متقی خاتون تھیں۔ اُن کی تربیت نے سر سیّد کے دل و دماغ میں مذہب کی محبت اور وقعت اس شان و کمال کے ساتھ مستحکم کر دی کہ زندگی کے آخری لمحہ تک سر سید کی زندگی اُسی کی مسلسل جلوہ ریزیوں سے منور رہی۔ دستور زمانہ کے مطابق سر سید نے فارسی اور عربی میں تعلیم حاصل کی۔ اُن کی ذہانت، محنت اور ذوق و شوق کا یہ عالم تھا کہ اٹھارہ برس کے سن میں انھوں نے تعلیم کے مدارج طے کر لئے۔ اسی زمانہ میں انھوں نے

مضمون نگاری شروع کی۔ اُن کے مضامین سید الاخبار میں
چھپتے تھے، جو غالباً اردو میں سب سے پہلا اخبار ہے اور جسے
اُن کے بڑے بھائی سید محمد خاں نے جاری کیا تھا۔ دہلی اس
دور میں نشاط و تفریح اور علمی نمود کمال کا گہوارہ بنی ہوئی
تھی۔ بجھنے سے پہلے شمع بھڑک اُٹھتی ہے، اور مغلوں کی دہلی
بھی اسی دور سے گذر رہی تھی۔ سرسیّد بھی اس سوسائٹی میں بڑے
ذوق و شوق سے اپنی ذہانت اور نشاط پسندی کے سبب ممتاز
رہے۔ مشاعروں میں شرکت کرتے اور دادِ سخن پاتے رہے۔
اُن کا تخلص آہی تھا۔ یہ تین چار برس بادۂ شبانہ کی سرمستیوں
کی نذر ہو گئے۔ اور غالباً یہی وہ تجربہ تھا جس نے آئندہ چل کر
پکار پکار کر اُن سے کہا کہ "اُٹھے بس اب کہ لذتِ خوابِ سحر گئی!"
۱۸۳۸ء میں اُن کے والد کا انتقال ہو گیا اور اُنھیں تلاش
معاش کے لئے کاوش کرنی پڑی ملازمت کا آغاز انھوں نے
سررشتہ داری کی حیثیت سے کیا ۱۸۳۹ء میں آگرہ جا کر دفتر کمشنری
میں نائب منشی کے عہدے پر فائز ہو گئے جہاں دو ڈھائی برس مقیم
رہے۔ سرسید کے اندر علم و ادب کی سچی تڑپ تھی۔ اُس نے
روزِ اوّل سے اُن کو علمی خدمات پر مائل رکھا۔ یہیں انھوں نے اپنی
سب سے پہلی تاریخی تالیف "جامِ جم" ۱۸۴۰ء میں شائع کرائی۔
اور اسی دوران میں کئی اور رسالے بھی لکھے ۱۸۴۱ء میں منصفی

کا امتحان پاس کر کے مین پوری میں بحیثیت منصف مقرر ہوئے۔ ایک سال کے بعد تبدیل ہو کر فتح پور سیکری آ گئے جہاں چار سال قیام رہا۔ اُن کی علمی دلچسپیاں روز بروز بڑھتی گئیں، فتح پور سیکری کے دوران قیام میں انھوں نے مذہبی اور علمی موضوعات پر کئی رسالے شائع کئے۔ انھیں ایّام میں تیموری خاندان کے آخری بادشاہ بہادر شاہ ظفر نے "جوادالدّولہ عارف جنگ" کے خطاب سے اُنھیں سرفراز کیا۔ ۱۸۴۵ء میں سید صاحب کے بڑے بھائی کا انتقال ہوا، بھائی کی موت کا اُن کے دل و دماغ پر ایسا اثر ہوا کہ عیش دنیا ہمیشہ کے لئے ہیچ ہو کر رہ گیا۔ انھوں نے اپنی زندگی کا نظام بالکل بدل ڈالا۔ رنگین مزاج نوجوانوں کی راہ چھوڑی اور ثقہ مولویوں کا مسلک اختیار کر لیا۔ ڈاڑھی بڑھالی۔ لباس کو شرعی حدود میں کر لیا۔ اور اس انداز سے زندگی کو سنجیدگی کے قالب میں ڈھال لیا۔ ۱۸۴۶ء میں وہ منصفی کے عہدے پر اپنے وطن دلّی آ گئے۔ اس وقت اُن کا سن اُنتیس سال تھا! اور یہی زمانے سے سر سیّد کے پائیدار علمی کاموں کا دور شروع ہوتا ہے۔ اُنھوں نے دلّی کے مشہور عالموں سے عربی اور فارسی کی معیاری کتابیں پڑھیں۔ قرآن مجید کی سند لی۔ اور بڑے ذوق و انہماک کے ساتھ تصنیف اور تالیف میں مصروف ہو گئے ۱۸۴۷ء میں سر سیّد نے اپنی یادگار تصنیف "آثار الصنادید" شائع

کی۔ اس کتاب میں دہلی کی قدیم عمارتوں اور قدیم تاریخ کا بیان
ہے۔ اس کی تیاری کے لئے سرسیّد نے جو مشقتیں اُٹھائیں ان
پر نگاہ کرنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ کتنے عالی حوصلہ، صاحب
ہمت اور گہرے علمی ذوق سے بہرہ ور تھے۔ مولانا حالی نے لکھا
ہے کہ بعض عمارتوں کے کتبے پڑھنے کے لئے اُنھیں گھنٹوں چھینکو
پر لٹکا رہنا پڑتا تھا۔ کتاب کا پہلا ایڈیشن ۱۸۴۷ء میں شائع
ہوا۔ اور ۱۸۵۴ء میں اضافوں کے ساتھ اس کا دوسرا ایڈیشن نکلا۔
"آثار الصنادید" اس پایہ کی کتاب ہے کہ اُس کے مطالعے سے
اُس کے مصنف کے ذوقِ تحقیق، تاریخ دانی، علمی طبیعت اور بالغ
فکر پر بہت واضح روشنی پڑتی ہے۔ ہندستان کے باہر یورپ کے
علمی حلقوں میں بھی اس کتاب کی بڑی قدر ہوئی۔ اور فرانس کے
مشہور عالم گارساں دتاسی نے فرنچ زبان میں اس کا ترجمہ شائع
کیا۔ مولانا حالی نے "آثار الصنادید" کے سلسلہ میں بہت دلچسپ
بات لکھی ہے جس سے سرسید کے مزاج و طبیعت کے سمجھنے میں
بڑی مدد ملتی ہے۔ مولانا نے لکھا ہے کہ آثار الصنادید کی تکمیل
کے لئے سرسید نے پرانی عمارتوں اور کھنڈروں کا جو معائنہ
اور مطالعہ کیا تو انھیں وہ نگاہِ بصیرت حاصل ہوگئی جو علم و دانش
کی کتابیں نہیں دے سکتیں، صرف عبرت کدے دے سکتے ہیں
دہلی کے دوران قیام میں انھوں نے تاریخ، تصوف، مذہب،

اور طبیعیات غرض مختلف موضوعات پر کئی رسائل لکھے۔

جنوری ۱۸۵۵ء میں سرسید کا بجنور تبادلہ ہو گیا۔ اور وہ صدر امین کے عہدے پر فائز ہو گئے۔ بجنور کے دوران قیام میں انھوں نے اعلیٰ معیار کے علمی کام انجام دیے۔ تاریخ بجنور مرتب کی ابوالفضل کی مشہور کتاب "آئین اکبری" تصحیح کے بعد اور حواشی کے ساتھ شائع کی۔ ۱۸۵۷ء میں غدر ہوا۔ جس نے ہندستان کی قسمت کی طرح سرسید کی کایا بھی پلٹ دی ۵۷ء میں سرسید کا سن چالیس برس کا تھا۔ وہ ایک اچھے منتظم اور حکومت کے ایک دیانتدار اور فرض شناس افسر کی حیثیت سے کافی شہرت حاصل کر چکے تھے اور مختلف موضوعات پر تصنیف اور تالیف کر کے اپنے مطالعے، ذہانت اور زور قلم کی داد و تحسین علمی حلقوں سے بخوبی حاصل کر چکے تھے۔ گویا یہ وہ دور تھا جب سرسید کا ذہن اُس بڑے کام کے لئے بن رہا تھا جس کی خاطر قدرت نے اُن کو تخلیق کیا تھا۔ غدر کے بعد سرسید کو چالیس برس اور زندہ رہنے کا موقعہ ملا۔ اور یہ آخری چالیس برس اُن کی زندگی کے اُن پائیدار کارناموں سے عبارت ہیں جو ہماری تاریخ کا جزو ہو گئے ہیں۔

۵۷ء کے غدر نے ہندستان کی بساطِ زندگی اُلٹ دی۔ مغلوں کی حکومت خاک میں مل گئی۔ تاج والے بے تاج ہو گئے اور جن

کی حویلیوں کے سامنے ہاتھی جھومتے تھے وہ نانِ شبینہ کو محتاج ہوگئے۔ سینکڑوں انسان قتل ہوگئے ہزاروں خاندان تباہ ہوئے اور لاکھوں کروڑوں انسان ذہنی کرب و بے چینی کی آفت میں مبتلا ہوگئے۔ یہ نظارہ جس قدر عبرت انگیز تھا، اتنا ہی المناک بھی۔ اور کوئی بھی ایسا دل جس میں درد تھا، ایسا نہ تھا جس کا خون آبِ اشک بن کر آنکھوں تک نہ آگیا ہو۔ حالی کا مشہور مطلع درد و کرب کی اس کیفیت کو پوری طرح واضح کرتا ہے کہ:۔

تذکرہ دہلیِ مرحوم کا اے دوست نہ چھیڑ
نہ سنا جائے گا ہم سے یہ فسانہ ہرگز!

یا ختمِ کلام پر حالی کا یہ قول کہ:۔

بزمِ ماتم تو نہیں، بزمِ سخن ہے حالی
یاں مناسب نہیں رو رو کے رلانا ہرگز!

سر سید کے دل میں اخلاص تھا۔ انھیں بھی چوٹ لگی اور گہری چوٹ لگی۔ اُن کی نگاہِ دانشمند نے دیکھ لیا تھا کہ ہندستانی نظامِ سیاست فرسودہ اور پامال ہو چکا ہے اور انگریزی نظمِ زندگی کے سامنے اُس کے پاؤں ٹھیرتے نظر نہیں آتے۔ انھوں نے کھلے طور پر انگریزوں کی مدد کی۔ انگریزوں کی جانیں بچائیں اور یہ کوشش کی کہ یہ غیر منتظم فتنہ و فساد دب جائے۔ لیکن جیسا کہ سر سید

کی زندگی کے بعد کے واقعات نے ثابت کیا غدر میں سرسید نے انگریزوں کی مدد جاہ و دولت کی لالچ میں ہرگز نہ کی۔ اُن کے صحیح تاثرات کا اندازہ اس واقعہ سے ہوسکتا ہے کہ غدر کے بعد انگریزوں نے سرسیدؒ کو اُن کی خدمات کے صلہ میں جب تعلقۂ جہاں آباد جو اُس وقت ایک لاکھ روپیہ سے زیادہ کی مالیت کا تھا، دینا چاہا تو اُن کے دل کو بہت صدمہ پہنچا۔ اپنے اک لیکچر میں اپنے جذبات کو جو اس موقعہ پر اُبھر آئے تھے، ظاہر کرتے ہوئے کہا:۔ "میں نے اپنے دل میں کہا کہ مجھ سے زیادہ نالائق کوئی دنیا میں نہ ہوگا کہ قوم پر تو بربادی ہو اور میں اُن کی جائداد لیکر تعلقہ دار بنوں۔ میں نے اُس کے لینے سے انکار کر دیا۔"

۱۸۵۸ء میں سرسید صدر الصدور کے عہدے پر فائز ہوکر مرادآباد آگئے۔ یہ دور اُن کے لئے بڑے ذہنی درد و کرب کا دور تھا۔ اس زمانے کی ذہنی حالت اپنے اک لیکچر میں انھوں نے اس طرح بیان کی ہے "میں اُس وقت ہرگز نہیں سمجھتا تھا کہ قوم پھر پنپے گی اور کچھ عزت پائے گی، اور جو حال اس وقت قوم کا تھا، مجھ سے دیکھا نہیں جاتا تھا۔ چند روز میں اسی غم میں رہا۔ آپ، یقین کیجئے کہ اس غم نے مجھے بڈھا کر دیا اور میرے بال سفید کر دئے۔ جب میں مرادآباد آیا، جو اک بڑا غمکدہ ہماری قوم کے

زمینوں کی بربادی کا تھا۔ اس غم کو کسی قدر اور ترقی ہوئی۔ مگر اس وقت یہ خیال پیدا ہوا کہ نہایت بے مروّتی کی بات ہے کہ قوم کو اس تباہی میں چھوڑ کر میں الگ کسی گوشۂ عافیت میں جا بیٹھوں۔ نہیں اس کی مصیبت میں شریک رہنا چاہیئے اور جو بھی مصیبت پڑے اُس کے دور کرنے میں ہمت باندھنی قومی فرض ہے۔ میں نے ارادہ ہجرت موقوف اور قومی خدمت کی ہمت باندھنے کا ارادہ کر لیا۔" یہی قومی ہمدردی سر سیّد کے آیندہ چالیس سالہ کارناموں کا عنوان بن گئی۔

سر سیّد نے آیندہ کام کا جو پروگرام بنایا" وہ مختصر یہ ہے:

۱۔ انگریزی حکومت اور انگریز قوم کو ہندستان اور ہندستانیوں سے متعلق جو غلط فہمیاں ہیں اُنھیں دور کیا جائے۔ اور اُن کے بغض وعناد کو مٹا کر ہندستانیوں کے لئے اُن کے دل میں رحم ومحبت کے جذبات پیدا کئے جائیں۔

۲۔ ہندستانیوں کو نئے تغیر اور انقلاب کی حقیقت پر غور کرنے اور اُس کے مطابق اپنی زندگی کو نئے سانچے میں ڈھالنے کے لئے آمادہ کیا جائے۔

۳۔ نئے طرز پر ہندستانیوں کی معاشی، تعلیمی اور مذہبی اصلاح کا کام انجام دیا جائے۔

۱۸۵۹ء میں اُن کا مشہور رسالہ "اسباب بغاوت ہند" نکلا۔

یہاں سے گویا اُن کے اصلاحی کام کا آغاز ہوا۔ سرسید نے دیکھا
کہ مسلمانوں میں عموماً اور بالخصوص طبقہ علماء میں انگریزوں کی طرف سے
اتنی غلط فہمیاں ہیں کہ وہ انگریزوں کی دشمنی میں نئے علوم اور
نئے طرز زندگی سے بھی بیزار ہیں۔ انھوں نے محسوس کیا یہ بیزاری
اس طرح دور ہو سکتی ہے کہ مسیحیت اور اسلام کے درمیان جو مشترک
چیزیں ہیں اُن کو اُبھارا اور نمایاں کیا جائے۔ اور اسی لیے انھوں
نے انجیل کے چند حصوں کی نئی تفسیر شائع کی ۱۸۶۲ء میں جب
وہ غازی پور میں تھے، انھوں نے سائنٹفک سوسائٹی قائم کی جس
کا مقصد اعلیٰ معیار کی قدیم کتابوں کو نئی ترتیب کے ساتھ شائع
کرنا اور نئے علوم کی مفید کتابوں کے انگریزی ترجمے چھپوانا تھا
۱۸۶۴ء میں اُن کا علی گڑھ تبادلہ ہو گیا۔ اُن کی سوسائٹی کا دفتر
بھی یہیں علی گڑھ ہی آگیا۔ سوسائٹی کے کاموں میں اب بہت باقاعدگی
اور نظم پیدا ہو گیا۔ مشہور اخبار علی گڑھ انسٹیٹیوٹ گزٹ نکلا۔ جس
نے اصلاحی تحریک کو پروان چڑھانے میں بیش بہا خدمت انجام
دی۔ ۱۸۶۷ء میں وہ جج ہو کر بنارس چلے گئے دو برس کے بعد
رخصت لیکر وہ سفر انگلستان پر گئے۔ انگلستان کے دوران قیام
میں انھوں نے ایک زبردست علمی خدمت انجام دی۔ جو یادگار
شان اور امتیاز کی مالک ہے۔ لندن میں بیٹھ کر سرسید نے سر ولیم
میور کی مشہور کتاب "لائف آف محمدؐ" کے جواب میں اپنی گرانمایہ

modern urdu literature کا جو لقب عطا کیا ہے اسی بنیاد پر وہ اس کے مستحق ہیں۔

سرسید کی تصانیف

سرسید کی تصنیفی زندگی کا آغاز ۱۸۴۲ء سے ہوا۔ اور اُن کے قلم کی روانی تادم آخر رہی۔ اس طرح گویا اُن کی تصنیف و تالیف کی مدت ستاون برس کی ہوتی ہے۔ انھوں نے تاریخ اور مذہبیات سے اپنے تصنیفی سلسلہ کا آغاز کیا اور وقت کے ساتھ ساتھ اس کا دائرہ برابر وسیع ہوتا گیا۔ غدر تک یعنی ابتدائی سترہ برس میں اُن کی سب سے معرکہ آرا تصنیف "آثار الصنادید" شائع ہوئی۔ جو ایک اعلیٰ پائے کی محققانہ کتاب ہے اور جس سے نہ صرف اُن کی کاوش فکر، بلکہ محنت و مشقت کا زبردست ثبوت فراہم ہوتا ہے اُن کا ایک یادگار کارنامہ آئین اکبری اور تاریخ فیروز شاہی کو بڑی جانکاہی سے ایڈٹ کر کے شائع کرنا بھی ہے۔ جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ٹھوس قسم کے علمی کاموں سے اُن کو کتنا گہرا ذوق تھا۔ لیکن ایک اعلیٰ پائے کے مصنف ادبی مجتہد اور طرز جدید کے موجد کی حیثیت سے اُن کا کام غدر کے بعد شروع ہوتا ہے ۱۸۶۶ء میں سائنٹفک سوسائٹی کی جانب سے علی گڑھ انسٹیٹیوٹ گزٹ کا اجرا ہوا اور اب سرسید نے اپنے اصلاحی مشن کی خاطر مختلف النوع موضوعات پر قلم اُٹھایا۔ ۱۸۷۰ء میں تہذیب الاخلاق

جاری ہوا اور سرسید کے اس رسالے کو صحیح معنی میں جدید اردو ادب کا سنگ بنیاد کہا جا سکتا ہے۔ تہذیب الاخلاق کا اجراء انگلستان کے مشہور جرائد "ٹیٹلر" اور "اسپیکٹیٹر" کی تقلید میں کیا گیا۔ اس پرچے کے مقاصد پر روشنی ڈالتے ہوئے سرسید نے لکھا تھا "اس پرچے کے اجرا سے مقصد یہ ہے کہ ہندستان کے مسلمانوں کو کامل درجے کی سولیزیشن یعنی تہذیب اختیار کرنے پر راضی کیا جائے تاکہ جس حقارت سے سوی لائزڈ یعنی مہذب قومیں انھیں دیکھتی ہیں وہ بھی رفع ہو اور وہ بھی دنیا میں مہذب و معزز قوم کہلائے۔"......... "ہمارا مطلب اپنے وطن کے مسلمان بھائیوں سے ہے اور اسی مقصد کے لئے پرچہ جاری کرتے ہیں تاکہ بذریعہ اس پرچے کے جہاں تک ہم سے ہو سکے ان کے دین و دنیا کی بھلائی میں کوشش کریں اور جو نقائص ہم میں ہیں۔ گو ہم کو نہ دکھائی دیتے ہوں مگر غیر قومیں انھیں بخوبی دیکھتی ہیں اُن سے انھیں مطلع کریں اور جو باتیں عمدہ ان میں ہیں انھیں ترقی کرنے کی رغبت دلائیں۔" ان چند فقروں کے مطالعے سے یہ چیز بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ تہذیب الاخلاق کے سامنے ہمہ گیر اصلاح کا ایک واضح تصور موجود تھا۔ اس کے صفحات پر ادب، معاشرت، علمی و ادبی سوالات، مذہب کے مسائل غرض کوئی چیز ایسی نہ تھی جو زیر بحث نہ آئی ہو۔ اس طرح تہذیب الاخلاق

نے وسعتِ نگاہ کے ساتھ ایک کشادہ میدان میں انشار اور
زورِ قلم کے مظاہرے کئے اور اس طرح اُردو کے دائرہ نثر میں
بڑی وسعت پیدا ہو گئی۔ یہ پرچہ تسلسل کے ساتھ جاری نہ رہ سکا
پہلی بار سات برس کچھ مہینے تک نکلتا رہا۔ دوسری بار اس سے
بھی کم یعنی سوا دو برس نکلا۔ اور تیسری بار بھی قریب اتنے
ہی دنوں شائع ہوا۔ تہذیب الاخلاق کا دورِ اول نہ صرف بہت
شاندار تھا بلکہ اُس کی تاریخی اہمیت یہ ہے کہ اس نے نئے اردو
ادب کا مزاج بنایا اور وہ راہیں مقرر کیں جن پر اُسے آئندہ سفر
ترقی طے کرنا تھا۔ قومی ضرورتوں کے پیشِ نظر سر سید نے مختلف
موضوعات یعنی تعلیم معاشرت اور ادب وغیرہ پر خطبات بھی دئے
اور جدید اردو ادب کی ساخت و تعمیر میں ان خطبات کا بھی ایک
خاص حصہ ہے۔

سر سید کی اہم تصانیف مندرجہ ذیل قرار دی جا سکتی ہیں:۔

۱۔ آثار الصنادید (جس کا پہلا ایڈیشن ۱۸۴۷ء اور دوسرا ایڈیشن
۱۸۵۴ء میں شائع ہوا۔

۲۔ اسبابِ بغاوتِ ہند (جو ۱۸۵۸ء میں چھپی)۔

۳۔ خطباتِ احمدیہ (سوانح و سیرت محمدی پر سر سید کے تحقیقی مقالات
جو لندن میں اردو اور انگریزی میں شائع ہوئے)

۴۔ نا تمام تفسیر قرآن (اس تفسیر میں سر سید نے اجتہاد فکر سے

کام لیکر نئے علوم وسائنس کی روشنی میں آیات قرآنی کی توجیہ وتفسیر کی ہے۔

۵۔ مجموعۂ مضامین ومقالات تہذیب الاخلاق میں شائع ہونے والے ان کے مضامین ومقالات جو مختلف موضوعات سے متعلق ہیں اور وسعتِ مطالعہ اخلاص فکر اور زور استدلال کا حیرت انگیز نمونہ پیش کرتے ہیں۔

۶۔ مجموعۂ لکچرس اس میں اُن کے تعلیمی اصلاحی، سیاسی ہر قسم کے خطبات شامل ہیں۔

ان اہم تصانیف کے علاوہ بڑی تعداد میں رسائل وغیرہ موجود ہیں۔

سرسیدؒ کے مقالات

سرسیدؒ کے مقالات، علمی ادبی اور لسانی اہمیت سے بہرہ ور ہیں، مقالات کے سلسلہ میں نگاہ میں رکھنے والی سب سے پہلی چیز یہ ہے کہ بہ کثیر الانواع موضوعات پر لکھے گئے ہیں اور قریب بیس برس تک ایک ایسے انسان کے قلم سے نکلے ہیں جو نہ صرف ادبی مذاق میں صحیح طور پر بالغ النظر ہو بلکہ جسے زمانے کے گوناگوں تجربات فکر کی مشق ومماسرت اور ایک زبردست اصلاحی جذبہ نے یہ یک وقت شمشیر بے نیام بھی بنا دیا ہو اور ہوائے موسم گل بھی۔ سرسید انقلابی نہیں تھے مصلح تھے اُن کے یہاں کام کرنے کا وہی جذبہ

موجود ہے جو ایک انقلابی کے یہاں ہوتا ہے۔ لیکن ٹھنڈے دل ودماغ کے ساتھ ہر قدم جائزہ لیتے ہوئے آگے چلنا اور سمجھا بجھا کر اپنے نقطۂ نظر کو منوانا۔ معقولیت اور زور استدلال کی بنیاد پر اپنی بات تسلیم کرانا اور اس طرح اپنے منصوبوں کو عملی جامہ پہنانے کے لئے کوشش کرنا یہ ہے سرسید کا طریق کار اسی لئے اُن کے مقالات کا موضوع کچھ ہی کیوں نہ ہو سب کا انداز ایک خاص قسم کی واعظانہ، ناصحانہ اور مصلحانہ شان رکھتا ہے۔ اور ان سب میں یہ جذبہ نمایاں طور پر کارفرما نظر آتا ہے کہ یہ دلوں کو بدلنے اور ذہنوں کا رخ پھیرنے کے لئے قلم کی زبان پر آئے ہیں۔

مقالات سرسید کا یہ پہلو خاص طور پر اہمیت رکھتا ہے، اس لئے کہ اس کو بخوبی سمجھ لینے سے اُن کا صحیح مزاج نگاہوں کے سامنے آجاتا ہے۔ ہندستان اور بالخصوص مسلمانوں کے زوال و تباہی کا سرسید نے جو جائزہ لیا اس کے اسباب بنیادی طور پر انھیں یہ نظر آئے :۔

ا۔ یہ کہ مسلمانوں میں طلبِ علم اور شوقِ اجتہاد کے دروازے صدیوں سے بند تھے۔ انھوں نے اپنے پیش روؤں کے اندوختے پر قیامت تک کے لئے قناعت کر لی ہے اور پانچسو برس پہلے کی بات کو قیامت تک کے لئے وہ حرفِ آخر سمجھتے ہیں۔ اس ذہنی بے حوصلگی نے انھیں اس قابل نہیں رکھا کہ وہ بڑھتے ہوئے

زمانے کے مطابق ہو سکیں۔ اور ترقی علوم کے قدم بقدم چلیں۔

۲۔ یہ کہ مذہب کے حقائق کی پرانے علماء نے جو توجیہیں کی ہیں انھیں اٹل سمجھ لینا، اور اس پر دھیان نہ دینا کہ مذہب اور فطرت (نیچر) کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ اور فطرت کے نئے نئے اُبھرتے ہوئے رُوپ مذہب کی حقیقت کو روشن کرتے رہتے ہیں۔

۳۔ یہ کہ رسم و رواج اجتماعی تعلقات کے قیام و ترقی کے لئے باقاعدہ اور واضح صورت اختیار کرتے ہیں لیکن زمانے کی ترقی کے ساتھ پرانے رسوم و رواج اپنی اہمیت کھو بیٹھتے ہیں۔ اور ٹھیک اسی طرح جس طرح انسان زمانے کے بدلتے ہوئے حالات کے ساتھ فطری طور پر بدلتا رہتا ہے، عاقل اور ترقی پرور قوموں کا خاصہ یہ ہوتا ہے کہ وہ عزم و ارادے کے ساتھ پرانے رسم و رواج سے چپٹے رہنے کی بجائے زندگی کے خاکے میں نئے رنگ بھرتے رہتے ہیں۔ اسی لئے اُن کی زندگی کا ہرانی د ترقی کی علامت بن جاتی ہے۔

۴۔ یہ کہ مغرب نے پچھلے پانچسو برس میں علم اور سائنس کے میدان میں جو ترقیاں کی ہیں وہ جائز طور پر اس کا تقاضہ کرتی ہیں کہ بے تعصبی و قدر و منزلت کے ساتھ اُن کی اہمیت محسوس کی جائے اور اُن سے پورا پورا فائدہ اٹھایا جائے اس لئے کہ انسانی تاریخ کا یہ مسلّم دستور ہے کہ علم کی دولت کسی قوم قبیلے

یا ملک کی چیز نہیں ہوتی بلکہ انسانیت کی مشترکہ ملکیت ہوتی ہے۔ قومیں اپنے ذوقِ نمود میں لاکھ اپنی چھاپ اس پر لگانے کی کوشش کریں۔ لیکن علم کی فطرت پکار پکار کر اپنی عالمگیر حیثیت کا اعلان کرتی رہتی ہے۔ اس لئے ضروری ہے کہ ہندوستانی اور بالخصوص مسلمان مغربی علوم سے پورا پورا فائدہ اٹھائیں اور زندگی کے اس نقشے کو فطری مدوں میں قبول کر لیں جو مغرب کی گود میں پل کر جوان ہوئی ہے۔

رسم و رواج کی اصلاح مذہبی فکر میں ذوقِ اجتہاد اُبھارنا، مغربی علوم و فنون سے شوق و رغبت دلانا اپنے ماضی کو مستقبل کے حوصلوں میں سمو کر زندہ کرنا، تعلیم کا عام نظام قائم کر کے زمانے کے مزاج کو پہچاننا اور ترقی کی منزل کی طرف بڑھنا، یہ ہیں سر سید کی تحریک کے مقاصد ——— مندرجہ ذیل ٹکڑوں پر نگاہ کرنے سے سر سید کا تصوّر واضح ہو گا۔

"اگر ہماری قوم میں صرف جہالت ہی ہوتی تو چنداں مشکل نہ تھی ——— مشکل تو یہ ہے کہ قوم کی قوم جہل مرکب میں مبتلا ہے۔ علوم جن کا رواج ہماری قوم میں تھا یا ہے اور جس کے نکمے سے ہر ایک پھولا ہوا ہے، دین و دنیا دونوں میں بکار آمد نہیں۔ غلط اور بے اصل باتوں کی پیروی کرنا اور بے اصل اور اپنے آپ پیدا کئے ہوئے خیالات کو امور واقعی و حقیقی سمجھ لینا، اور پھر ان پر

فرضی بحثیں بڑھائے جانا، اور دوسری بات کو گو وہ کیسی ہی سچ اور واقعی کیوں نہ ہو، نہ ماننا، لفظی بحثوں پر علم و فضیلت کا دار و مدار ہونا، اُن کا نتیجہ ہے۔

علم ادب و انشاء کی خوبی صرف لفظوں کے جمع کرنے اور ہموزن اور قریب التلفظ کلموں کے تک ملانے، اور دور از کار خیالات بیان کرنے، اور مبالغہ آمیز باتوں کے لکھنے پر منحصر ہے یہاں تک کہ دوستانہ خط و کتابت اور چھوٹے چھوٹے روزمرہ کے رقعوں میں بھی یہ سب برائیاں بھری ہوئی ہیں۔ کوئی خط یا رقعہ ایسا نہ ہوگا جس میں جھوٹ اور وہ بات جو درحقیقت دل میں نہیں ہے مندرج نہ ہو۔ خطوط رسمیہ کے پڑھنے سے ہرگز تمیز نہیں ہو سکتی کہ حقیقت میں اس خط کا لکھنے والا ایسا ہی ہمارا دوست ہے جیسا کہ اس میں لکھا ہے، یا یہ صرف معمولی مضمون ہے جس کے لکھنے کا عموماً رواج پڑ گیا ہے۔ پس ایسی تحریر کا اثر ہمارے دلوں سے کھو دیا ہے اور ہم کو جھوٹی اور بناوٹی تحریر کا عادی کر دیا ہے۔

فن شاعری جیسا ہمارے زمانہ میں خراب اور ناقص ہے، اس سے زیادہ کوئی چیز بری نہ ہوگی۔ مضمون تو بجز عاشقانہ کے اور کچھ نہیں ہے، وہ بھی نیک جذبات انسانی کو ظاہر نہیں کرتا بلکہ ان جذبات کی طرف اشارہ کرتا ہے جو ضد حقیقی تہذیب

و اخلاق کے ہیں!
خیال بندی کا طریقہ اور تشبیہ و استعارہ کا قاعدہ ایسا خراب اور ناقص پڑ گیا ہے، جس سے ایک تعجب تو طبیعت پر آتا ہے مگر اس کا اثر مطلق دل میں یا خصلت میں یا اُس انسانی جذبہ میں جس سے وہ متعلق ہے کچھ بھی نہیں ہوتا۔ شاعروں کو یہ خیال ہی نہیں کہ فطرتی جذبات، اور اُن کی قدرتی تحریک، اور اُن کی جبلی حالت کا کس پیرایہ، یا کنایہ، یا اشارہ، یا تشبیہ و استعارہ، میں بیان کرنا کیا کچھ دل پر اثر کرتا ہے۔ ملٹن کی "پیراڈائز لاسٹ" کچھ چیز نہیں ہے۔ بجز اس کے کہ انسان کی طبیعت کی حالت کی تصویر ہے۔ جس کا ہر ہر شعر دل میں گھر کرتا جاتا ہے۔ شیکسپیر میں کچھ نہیں ہے بجز اس کے کہ اس نے انسان کا نیچر یعنی قدرتی بناوٹ طبیعت کو بیان کیا ہے۔ جو نہایت موثر انسان کی طبیعت پر ہے۔
علم دین تو وہ خراب ہوا ہے جیسا خراب ہونے کا حق ہے، ایسا معصوم، سیدھے سادے، سچے اور نیک طبیعت والے پیغمبر نے جو خدا تعالیٰ کے احکام بہت سدھاوٹ و صفائی و بے تکلفی سے جاہل، ان پڑھ، بادیہ نشیں عرب کی قوم کو پہنچائے تھے، اس میں وہ نکتہ چینیاں، باریکیاں گھیڑی گئیں اور وہ مسائل فلسفیہ اور دلائلِ منطقیہ لائی گئیں کہ اس میں اُس صفائی و سدھاوٹ اور سادہ پن کا مطلق اثر نہیں رہا۔ مجبوری لوگوں کو اصلی احکام

کو جو قرآن و معتمد حدیثوں میں تھے، چھوڑنا پڑا اور زید و عمرو کے بنائے ہوئے اصول کی پیروی کرنی پڑی۔

علم مجلس اور اخلاق اور برتاؤ دوستی کا ایک ایسے طریقہ پر پڑ گیا ہے، جو نفاق سے بھی بدتر ہے۔ اخلاق صرف منہ پر میٹھی میٹھی باتیں بنانے اور اوپری تپاک جتانے کا نام ہے۔ آپس میں دو شخص ایسی محبت اور دلسوزی کی باتیں کرتے ہیں کہ دیکھنے سننے والے ان دونوں کو یک مغز دو پوست سمجھتے ہیں۔ مگر جب اُن کے دل کو دیکھو تو یک پوست دو مغز سے بے میل ہیں۔ صرف مکاری اور ظاہرداری کا نام اخلاق رہ گیا ہے۔ اور بے ایمانی و دغابازی کا نام ہشیاری ——!

ظاہر ہے کہ سرسید کے سامنے جامع اور ہمہ گیر اصلاح کا کام تھا۔ سب سے پہلی ضرورت اس کی تھی کہ اُن کا نقطۂ نظر صحت کے اور وضاحت کے ساتھ لوگوں کے سامنے آسکے تاکہ وہ جانچ پرکھ کر اس کو قبول کر سکیں۔ سرسید نے بڑی قوت و بڑی خوبی سے اس اہم اور روح فرسا کام کو انجام دیا ہے۔ مقالات پڑھنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ سلف طریقوں سے ناظرین کو اپنا نقطۂ نظر سمجھاتے اور تسکین بخش انداز میں اپنی بات منوانے کے لئے قلم اُٹھاتے ہیں۔ سرسید نے نہ خیالی موضوعات پر لکھا ہے اور نہ جذبات میں گرمی اور وجد انگیز کیفیتیں پیدا

کرنے والے موضوعات اُن کے دائرہ میں آ جاتے ہیں۔ انھوں نے ایسا میدان ہی منتخب کیا ہے جہاں قلم پوری احتیاط، ذہن کی پوری بیداری اور استدلال کی پوری قوت کے ساتھ اٹھایا جاتا ہے یہ کھلی ہوئی بات ہے کہ وعظ و نصیحت کتنے ہی حقائق سے لبریز کیوں نہ ہو اور ان کی افادیت کتنی ہی اعلیٰ معیار کی کیوں نہ ہو، ذکر جام و مینا کے مقابلے میں بہر حال اُن کے بیان میں خشکی ہی رہے گی۔ اور سرسید نے تو پھوڑوں اور ناسوروں کو نشتروں سے دست و گریبان کیا ہے۔ یہی بہت بڑا کمال ہے کہ یہ نشتر زنی و جراحی ایک مشاق فن سرجن کی طرح انجام دی گئی ہے جو نہ مریض کی کراہوں سے مشتعل ہوتا ہے اور نہ تیمارداروں کی آہ و بکا سے پریشان و بدحواس!

جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے سرسید کی مقالہ نویسی کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ مسائل علوم و فنون مذہبی مباحث، سماج کی خرابی اور ترقی کے سوالات تعلیم کی ضرورت غرض زندگی کا کوئی شعبہ نہیں ہے جو ان کے دائرے میں نہ آ جاتا ہو۔

مثال کے طور پر چند عنوانات ہی پر نظر کرنے سے اُن کو دائرہ فکر کی وسعت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ تہذیب۔ ملک اور اُس کی گورنمنٹ، خیر دائم، آزادی رائے، تعصب، عورتوں کے حقوق

۱- طالب علموں کے نام ایک خط

میرے عزیزو! تم نے اس منزلِ ہستی میں قدم رکھا ہے اور
میں بہت سے مرحلے طے کر چکا ہوں۔ زندگی کی پُرفضا اور پُربہار
پہاڑی پر چڑھ کر اس کے عجائبات اور غرائبات کو ایک نظر
سے دیکھ کر مایوس قدموں اور حسرت بھرے دل سے نشیب
کی طرف اُتر رہا ہوں۔ اور زیادہ افسوس میرا اس سبب
سے ہے کہ عمر کی پہاڑی کی سیر کرتے وقت جو اوزار مجھے قدرت
نے عنایت کئے تھے اُن کو میں اپنی نادانی اور گمراہی سے مناسب
طور پر استعمال میں نہ لا سکا، پہاڑی کی ابتدائی منزل سے اس
کی بلند چوٹی تک جا بجا چمن لہرا رہے تھے۔ مرادوں اور آرزوؤں
کے گل ہر طرف کھل رہے تھے اور بلا استثنا ہر ایک منزل
میں خوشی اور امید کے خوشنما درخت خوشگوار پھولوں سے جھکے
ہوئے نظر آتے تھے اور ایک عجیب راحت بخش نسیم ہر ایک
چیز اور ہر ایک مقام میں تازگی اور شگفتگی بخشتی دکھائی دیتی
تھی، قصہ کوتاہ ہر ایک جگہ خوشی و انبساط کے سامان تھے۔
اذنِ عام تھا کہ مسافر جس طرح استعمال کرے۔ کسی طرح کی
روک ٹوک نہ تھی ان سے فائدہ اٹھانا محض مسافر کی عقل اور
خواہش پر منحصر تھا مگر حقیقت کہیں اس فرحت ناک منزل سے

آنکھیں بند کئے چلا آیا میں یہی سمجھتا رہا کہ یہ فضا اور یہ بہار اسی طرح چلی جائے گی اور یہ پُر لطف اور مسرت ناک سماں منزل کے آخری حصہ تک ختم نہ ہوگا۔ مگر یہ میری کیسی غلطی تھی، اب کے عمر کے آخری مقام پر کھڑا ہو کر پچھلی طے کی ہوئی منزل پر نظر ڈالتا ہوں تو سوائے حسرت اور افسوس کے کچھ حاصل نہیں ہوتا عمر کا جو نہایت پُر فضا اور پُر جوش حصہ تھا وہ گذر گیا۔ آگے کی طرف جو نظر ڈالتا ہوں تو سارے منظر وادی پُر خار معلوم ہوتے ہیں اور ایسی اونچی چڑھائی نظر آتی ہے کہ جس کا کامیابی کے ساتھ طے کرنا ایک موہوم سی اُمید ہے۔ سامنے کے منظر کی ڈراؤنی صورت اور طے کردہ منزل کی خوبصورتی اور بے نیل مرام چھوڑ آنے کے خیالات میرے دماغ کو ایسا پراگندہ کرتے ہیں کہ رہی سہی طاقت بھی سلب ہوتی معلوم ہوتی ہے۔

اے عزیزو! یہ مایوسی مجھے کیوں حاصل ہوئی اور کیوں میں حسب مراد دنیا سے بہرہ ور نہ ہوا؟ صرف اس سبب سے کہ میں نے وقت کی قدر نہ جانی۔ ابتدائے عمر میں جب کہ میں کچھ کر سکتا تھا اور اپنی بہبودی کی بنیاد قائم کر سکتا تھا میں نے کچھ نہیں کیا۔ بدقسمتی سے کوئی رہبر یا ہادی ایسا نہ ملا جو مجھے سیدھے رستے پر ڈالتا۔ کوئی مربی یا محسن ایسا نصیب نہ ہوا جو بہرے

افعال و اعمال کو مناسب سمت کی طرف رجوع کرنے کی کوشش کرتا۔ اپنی ہی مرضی اور اپنی عقل سے کسی کامل رہبر کے پاس بغیر اپنی کشتی کو کھیتا رہا یہاں تک کہ ایک خطرناک چٹان پر آ کر بحرِ ہستی کی بے انتہا سطح پر جو نظر ڈالتا ہوں تو دیکھتا ہوں جن لوگوں نے دانشمندی اور قاعدے کی پابندی سے کام لیا اور وقت کو بیش بہا سرمایہ سمجھا۔ وہ کیسے خوش و خرم بامراد بحرِ ہستی سے عبور کر رہے ہیں، یوں تو کون سی چیز تھی جو وقت کی پرواز اور اس سے مستفید ہونے کی ضرورت نہ جتاتی۔ مگر میں ہی نادانی سے اس کا ایما نہ سمجھا۔ سالہا سال سورج صبح سے نکل کر اس نیلگوں چھت پر اپنا معمولی دورہ کرتا ہوا مغرب میں جا ڈوبا۔ مگر میں یوں ہی کاہلی سے بیٹھا ہوا اس کے منہ کو تکتا رہا۔ اس کے قاعدے کی پابندی سے ذرا بھی سبق نہ لیا۔ چاند ہلال اور بدر ہو کر اپنے مقرر وقتوں پر ظاہر ہوتا رہا مگر مجھے اس کے نمونہ سے نصیحت حاصل نہ ہوئی۔ بہار اپنے معمولی وقتوں پر آئی اور عالمیوں کے واسطے خوانِ الوانِ نعمت بچھا کر چلی گئی۔ مگر حیف میں یہ نہ سمجھا کہ یہ میری ہی عمر کے ایک سال چلے جانے کا اشارہ کرتی ہے۔ کالے کالے مست بادل اپنے وقت پر آئے اور برس کے چلے گئے۔ بجلی نے آب و تاب کے ساتھ میری مندی ہوئی آنکھوں کو کھولنا چاہا۔ مگر صد افسوس

میرے خفتہ دل نے بیداری حاصل نہ کی۔ رعد نے نہایت زور شور سے
کڑک کڑک کر میرے کانوں کو کھولنا چاہا۔ مگر میرے کان پر جوں تک نہ چلی۔
ہوا تیز اور تند ٹھنڈی اور گرم سب قسم کی چلتی رہی مگر مجھے ذرا بھی ہوشیاری
نہ ہوئی۔ گھڑی ہر وقت میری جیب میں رہی اور مجھے اپنی عمر کی روانگی سے ہر منٹ اور ہر سکنڈ
وقت کی چوری سے خبر دیتی رہی۔ مگر میں نہ سمجھا کہ یہ در اصل
میری عمر رواں کے پاؤں کی آہٹ ہے۔ ہزاروں دفعہ جیب
سے نکال کر دیکھا۔ کبھی چھ بجے کبھی دس بجے کبھی بارہ بجے۔ مگر
حیف میں نہ سمجھا کہ یہ اپنی ہی عمر رفتہ کے نقش پا ہیں۔ ذوق کا
سچا اور پر فلسفہ شعر پڑھا مگر غور نہ کیا ؎

عزیزو اس کو نہ گھڑیال کی صدا سمجھو
یہ عمر رفتہ کی اپنے صدائے پا سمجھو

بہت دفعہ ریلوے اسٹیشن پر گیا ٹرین کو جانے کے لئے
تیار دیکھا، مسافر گٹھری باندھے سوار ہونے کے لئے تیاری
کر رہے ہیں اور بہت سے اپنی منزل مقصود پر پہنچنے کے
لئے خوشیاں منا رہے ہیں۔ اسنے میں انجن نے سیٹی دی
اور گھنٹی ٹن ٹن کر کے ریل یہ جا وہ جا۔ اب دیکھا تو نہ وہ ٹرین
ہے نہ وہ رونق، اسٹیشن پر ایک پژمردگی اور اداسی کا عالم۔
اس انقلاب سے میرے دل میں ایک خفیہ چوٹ لگی۔ مگر حیف
یہ نہ سمجھا کہ یہ ٹرین زندگی کی رفتار سے خبر دیتی ہے۔ جو لوگ

کہ سوار ہوئے ہیں وہ مسافر ملک عدم ہیں اور جو آتے ہیں وہ واردانِ ملک ہستی ہیں اب جب کہ سمجھ آئی اور تجربہ ہوا تو وہ زمانہ نہ رہا نہ وہ طاقت رہی اب جب کہ کسی اسکول یا کالج کی عمارت کے پاس سے گزرتا ہوں اور طالب علموں کے پڑھنے کی آواز میرے کان میں پڑتی ہے تو کھڑا ہو جاتا ہوں اور آہ سرد بھر کر کہتا ہوں کہ "افسوس اب میں دوبارہ لڑکا نہیں ہو سکتا۔" کیا اچھا ہو کہ میں اس تجربہ کے ساتھ پھر زندگی کا از سر نو سفر شروع کروں۔

اب کیا ہو سکتا ہے۔ لیکن اے طالب علمو! اور اے میرے ملک کے ہوشیار امیدوارو! میں حسرت کے ساتھ تم سے مخاطب ہوتا ہوں کہ میری تلف شدہ عمر تمہارے رستہ میں نوٹس بورڈ ہو جس پر یہ درج ہو کہ

"خبردار اس طرف خطرہ ہے سنبھل کر چلو"

۲- علم

جہاں اور بہت سے عجائبات قدرتِ الٰہی ہیں، اُنہی میں سے انسان کے خیالات بھی نہایت عجیب ہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ایک قسم کی مخلوقات ایک ہی سا خیال رکھتی ہے جانوروں کی وہ حرکات اور افعال جو جاندار ہونے کے سبب سے ہیں، اور وہ چیز جو محرک ان افعال یا حرکات کی بالواسطہ یا بلاواسطہ ہے، اُس کا کچھ ہی نام رکھو، مگر وہ وہی چیز ہے، جس کو انسانی حالت میں خیال کہتے ہیں۔

تمام افعال اور حرکات جانوروں کی بلاشبہ ارادی ہیں، اور کچھ شک نہیں کہ وہ متحرک بالارادہ ہیں، اُن کی تمام حرکتوں کا باعث "بالواسطہ یا بلاواسطہ" ایک خیال جلب منفعت مادی، جیسے غذا اور مسکن وغیرہ، یا غیر مادی، جیسے فرحت و انبساط اور بشاشت، یا خیال دفع مضرت مادی وغیر مادی کا ہوتا ہے، ہم نہیں پاتے کہ انسان میں اور کوئی چیز اس سے زیادہ ہے۔ بلاشبہ اتنا فرق پاتے ہیں کہ جانوروں میں وہ خیالات محدود، اور انسان میں نامحدود ہیں۔

مگر تعجب تو ہم کو اس بات سے ہوتا ہے کہ ہر گاہ ایک قسم کے جانوروں میں ایک ہی سے خیالات ہیں اور اُن پر وہ سب

ایک ہی سا یقین کامل رکھتے ہیں، تو تمام انسان بھی باوجود یکہ ایک قسم کے جاندار ہیں، ایک سے خیالات اور ایک ہی سا یقین کیوں نہیں رکھتے ہیں!

کبھی یہ سمجھ میں آتا ہے کہ جانوروں کے خیالات محدود ہونے کے سبب متفق ہیں، اور انسان کے خیالات میں نامحدود ہونے کے سبب وہ صفت نہیں ہے۔ مگر یہ بات تسلیم نہیں کی جا سکتی، اس لئے کہ نامحدود ہونے کے لئے مختلف ہونا ضروری نہیں ہے۔ پس انسانوں کے خیالات سے جہاں تک ہم کو واقفیت ہوئی، اسی قدر عجائبات قدرت الٰہی سے ہم کو زیادہ واقفیت ہوتی ہے اور ان خیالات کا صحیح ہونا یا غیر صحیح ہونا ہمارے اس فائدے میں کچھ نقصان نہیں پہنچاتا، بلکہ در صورت مختلف ہونے کے اور بھی زیادہ فائدہ دیتا ہے۔ اس لئے ہم اپنے اس آرٹیکل میں ایک انسان کے خیالات بیان کرتے ہیں جن کو وہ اس طرح پر لکھتا ہے:

"مجھکو خیال آیا کہ جس قدر اور جانوروں کو کرنا ہے، اتنا ہی مجھکو بھی کرنا ہے" یا اس سے زیادہ کرنا ہے۔ مگر میرے خیال میں یہ آیا کہ انسان کے سوا تمام جاندار مخلوقات کے لئے جن چیزوں کی ضرورت ہے، ان کے بنانے والے کاریگر نے سب کچھ ان کے ساتھ بنا دی ہیں، ان کو ان چیزوں کے بہم پہونچانے یا پیدا کرنے کی حاجت نہیں ہے۔ تمام

جانوروں کی خوراک بغیر ان کی سعی و تدبیر کے پیدا ہوتی
ہے۔ سرد ملک کے جانوروں کے لئے نہایت عمدہ پشمینہ
کا گرم لباس ان کے بدنوں پر پیدا کیا ہے۔ بہت جانوروں
کے لئے سردی سے بچنے کا بال اون کوٹ انہی کے بدنوں پر سیا
ہے۔ گرم ملک کے جانوروں کے لئے انہی آب و ہوا کے
مناسب ان کا جامہ قطع کیا ہے۔ مگر انسان کے لئے کچھ
نہیں کیا، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کو جو سب کچھ خود کرنا
ہے۔

پھر میں نے خیال کیا کہ حیوان اپنے کاموں کے کرنے
کے لئے کسی سے کچھ سیکھنے یا تعلیم پانے کے محتاج نہیں ہوتے
خود بخود سیکھے سکھائے ہی پیدا ہوتے ہیں، شہد کی مکھی کو رس
چوسنے کے لئے عمدہ قسم کے پھولوں کی شناخت کوئی نہیں بتاتا
اور اپنے گھروں کو ایسی عمدہ تقسیم سے بنانا جس میں ایک
مہندس بھی حیران ہو جاوے کوئی نہیں پڑھاتا۔ بئے کو
ایسا عمدہ اور محفوظ گھونسلا بنانا کوئی نہیں سکھاتا۔ مگر انسان
کو بغیر سیکھے کچھ بھی نہیں آتا۔

پھر میں نے خیال کیا کہ حیوان کے کام خواہ افعالِ جوارح
سے ہوں یا دوسری قسم سے، اور خواہ وہ از خود ان کو آتے
ہوں، یا تعلیم سے، نہایت محدود ہیں۔ مگر انسان کے ہر قسم کے

کام نامحدود ہیں۔ ان سب باتوں سے میں نے خیال کیا کہ انسان کو اور جانوروں سے بہت کچھ زیادہ کرنا ہے۔

پھر میں نے خیال کیا کہ ایسے بڑے کاریگر نے جو انسان کو اور جانوروں سے بھی زیادہ درندہ بنایا ہے، اور طرح طرح کی مشکلات میں ڈالا ہے، تو کیا چیز اس کو دی ہے، جس سے وہ یہ سب چیزیں کر سکتا ہے، اور تمام مشکلوں پر فتح پا سکتا ہے؟ اتنے میں میرا دل بول اٹھا کہ "عقل!"

میں یہ بات سنکر سوچ میں گیا کہ کیا یہ بات سچ ہے؟ مگر میں نے خیال کیا کہ عقل سے تو یہ کام نہیں نکل سکتا۔ نہ تو وہ خود یہ کام نکال سکتی ہے، اور نہ اس کے بغیر یہ مشکل حل ہو سکتی ہے۔ یہ تو کسی دوسری چیز کے حاصل کرنے کو بطور آلہ کے ہے، جیسے کہ سونا چاندی ہماری بھوک نہیں کھو سکتا، مگر اس چیز کو ہم پہونچا دیتا ہے، جو ہماری بھوک کھو دیتی ہے۔ بہت سی تلاش اور جستجو میں نے کی، اور خیال دوڑایا کہ وہ کیا چیز ہے، جس کے حاصل کرنے کے لئے عقل بھی صرف آلہ ہے، تو خیال میں آیا کہ وہ چیز "علم" ہے جس کے معنی دانستن (جاننا) ہیں۔ تب میں سمجھا کہ مجھ کو اور جانوروں سے زیادہ جو کچھ کرنا ہے، وہ صرف تمام باتوں کی اصلیت دریافت کرنا ہے۔

۳- ترقی علم انشا

جہاں تک ہم سے ہو سکا ہم نے اُردو زبان کے علم ادب کی ترقی میں اپنے ان ناچیز پرچوں کے ذریعہ سے کوشش کی۔ مضمون کے ادا کا ایک سیدھا طریقہ اختیار کیا۔ جہاں تک ہماری کج مج زبان نے یاری دی الفاظ کی درستی، بول چال کی صفائی پر کوشش کی۔ رنگینیِ عبارت سے جو تشبیہات اور استعارات خیالی سے بھری ہوتی ہے اور جس کی شوکت صرف لفظوں ہی لفظوں میں رہتی ہے اور دل پر اس کا کچھ اثر نہیں ہوتا پرہیز کیا۔ تک بندی سے جو اس زمانہ میں مقفّٰی عبارت کہلاتی تھی ہاتھ اُٹھایا۔ جہاں تک ہو سکا، سادگیِ عبارت پر توجہ کی۔ اس میں کوشش کی کہ جو کچھ لطف ہو وہ صرف مضمون کے ادا میں ہو۔ جو اپنے دل میں ہو وہی دوسرے کے دل میں پڑے تاکہ دل سے نکلے اور دل میں بیٹھے۔ ہم کچھ نہیں کہہ سکتے کہ ہماری یہ کوشش کہاں تک کارگر ہوئی اور ہمارے ہم وطنوں نے اس کو کس قدر پسند کیا۔ مگر اتنی بات ضرور دیکھتے ہیں کہ لوگوں کے خیالات میں ضرور تبدیلی آگئی ہے اور اس کی طرف لوگ متوجہ بھی معلوم ہوتے ہیں۔ اخباروں کی عبارتیں نہایت عمدہ اور صاف ہوتی جاتی ہیں۔ وہ پہلا ناپسند طریقہ ادائے مضمون

کا بالکل چھوٹتا جاتا ہے۔ بھاری بھاری لفظوں اور موٹے موٹے فقروں سے اردو زبان کا خون نہیں کیا جاتا۔ صفائی اور سادگی روز بروز عبارتوں میں بڑھتی جاتی ہے۔ خیالات بھی بالکل بدلے ہوئے ہیں۔ بہت کم اخبار ایسے ہوں گے جن میں ہر ہفتہ کوئی نہ کوئی آرٹیکل عمدہ دلنشیں عبارت میں کسی نہ کسی مضمون پر نہ لکھا جاتا ہو۔ صرف اس بات کی کمی ہے کہ وہ سامان ہمارے پاس موجود نہیں ہے جس سے ہمارے معلومات زیادہ ہوں اور ہمارے خیالات کچھ درست ہوں۔ جو مضمون ہم لکھنا چاہیں ان کے ماخذ اور ان کے حالات اور جو بحثیں کہ ان پر ہو چکی ہیں اور جو امور ان کی نسبت متحقق ہو چکے ہیں ان سے آگاہی ہو۔ اور یہی سبب ہے کہ بعض دفعہ ہماری قوم کے آرٹیکلوں میں غلطی ہو جاتی ہے اور جن امور کا تصفیہ ہو چکا ہے ان پر کہ پھر سے جاتے ہیں۔ یہ نقص اسی وقت رفع ہوگا جب کہ انواع واقسام علوم و فنون کی کتابیں ہماری زبان میں موجود ہوں گی اور ہماری قوم کو عموماً ان پر دسترس ہوگی۔ سینٹفک سوسائٹی علی گڑھ نے اس کام کے پورا کرنے کا ارادہ کیا تھا۔ مگر افسوس ہے کہ قوم کو اس طرف توجہ نہیں ہے اور اسی سبب سے اس کا کام ادھورا پڑا ہے۔

کر

سی اردو نے درحقیقت ہماری ملکی زبان میں جان ڈالدی

ہے۔ میر و درد و ظفر نے اردو اشعار میں جو کچھ سحر بیانی کی ہوئی
ہو۔ میر مومن دہلوی نے کوئی کہانی شستہ بول چال میں کہہ دی
ہو، جو اس سے زیادہ فصیح و دلچسپ و بامحاورہ نہ ہو گی جو
ایک پوپلی بڑھیا بچوں کے سلاتے وقت ان کو کہانی سناتی
ہے۔ مضمون نگاری دوسری چیز ہے جو آج تک اردو زبان
میں نہ تھی۔ یہ اسی زمانہ میں پیدا ہوئی اور ابھی نہایت بچپن کی
حالت میں ہے۔ اگر ہماری قوم اس پر متوجہ رہے گی اور اتفاقی
خیالات کو نہ لائے گی جو اب حد سے زیادہ ارزاں ہو گئے
ہیں تو چند روز میں ہماری ملکی تحریریں بھی میکالے و اڈیسن کی سی
ہو جاویں گی۔

بعض لوگوں کو شکایت ہے کہ جو لوگ اس زمانہ میں اردو
لکھتے ہیں وہ انگریزی لفظ اپنی تحریروں میں ملاتے ہیں مگر ان کو
غور کرنا چاہیے کہ زندہ زبان میں ہمیشہ نئے نئے لفظ ملتے اور
بنتے ہیں اور جب کوئی زبان محدود ہو جاتی ہے مردہ کہلاتی
ہے۔ غیر زبان کے الفاظ کو اپنا کر لینا اہل زبان کا کام ہے
مگر ان کا ملا لینا آسان کام نہیں۔ اہل زبان غیر زبان کے لفظ
کو کیسی عمدگی سے ملا لیتے ہیں جیسے تاج گنج کے روضہ میں سنگ مرمر
پر عقیق و یاقوت و زمرد کی پچی کاری ہے بے شک وہ دوسرا
پتھر ہے مگر ایسا وصل ہوا ہے کہ غور سے دیکھنے پر بھی اوپر سے

جڑا ہوا نہیں معلوم ہوتا - اسی میں سے پیدا ہوا معلوم ہوتا ہے
یہ بات اہل زبان کے سوا دوسرے سے نہیں ہو سکتی اور نہ
سب اہل زبان سے، بلکہ صرف اس سے جسے خدا نے ایسا ملکہ
دیا ہو۔

یہ بات بھی غور کرنی چاہئے کہ اہل زبان کے لفظوں کے
لینے کی کیوں ضرورت پڑتی ہے۔ اس کے متعدد اسباب
ہوتے ہیں - ایک مورخ جو کسی ملک کی تاریخ لکھتا ہے اس کو
ضرور ہوتا ہے کہ اس ملک کے تاریخی الفاظ یعنی جو تاریخ سے
متعلق ہیں اور ملکوں کی تقسیم اور مناصب اسی ملک کی زبان
میں قائم رکھے کیوں کہ اگر ان کے لئے اپنی زبان کے الفاظ
اور اصطلاح بدل دے تو وہ تاریخ نہایت نکمی اور غیر مفید
ہو جاوے گی۔ ٹوٹس ہیں جو تاریخیں غیر ملکوں کی عربی زبان میں
ترجمہ تحقیق تصنیف ہوئی ہیں۔ ان کو دیکھو کہ کس قدر غیر زبان کے
الفاظ معرب وغیر معرب ان میں شامل ہیں۔ عربی اخبار الجوائب
کو دیکھو اس کا کیا حال ہے۔ قرآن مجید کو پڑھو اور دیکھو اس
میں کس قدر الفاظ دوسری زبانوں کے داخل ہیں۔ اگر عربی
کے علم ادب اور علوم و فنون میں الفاظ جدیدہ شامل ہونے
بند ہو جاتے تو وہ زبان بھی مثل عبرانی و سنسکرت و ژند کے
مردہ زبان ہو جاتی۔

علوم و فنون پر کتابیں لکھنے والا بعض دفعہ مجبور ہوتا ہے
کہ جس زبان سے اس علم کو لیا ہے اسی زبان کے بعض الفاظ و
مصطلحات بدستور قائم رکھے۔ دیکھو یونانی زبان سے جو علم طب
عربی میں ترجمہ ہوا کس قدر یونانی الفاظ اس میں شامل ہیں۔ اگر
کسی کو لیشر غس نہ ہو تو ضرور اس کو تسلیم کرے گا۔ عربی زبان
سے کمسٹری انگریزی میں گئی۔ آج تک بہت سے عربی لفظ انگریزی
زبان کی کمسٹری میں شامل ہیں۔

پوچھو کہ اس مقام پر میں نے کیوں لفظ کمسٹری بولا اور کیمیا
کا لفظ جس سے خود انگریزوں نے لفظ کمسٹری بنایا ہے کیوں
نہ بولا۔ اس کا سبب یہ ہے کہ ہم لوگوں میں کیمیا کے لفظ کے
ساتھ چاندی سونا بنانے کا خیال پیدا ہوتا ہے جو ایک محض غلط
خیال ہے۔ اب وہ شخص جو اپنی قوم کی ہمدردی رکھتا ہے اور
ان غلط خیالات کو مٹانا چاہتا ہے کسی جگہ کمسٹری اور کسی جگہ
کیمیا کا لفظ بول جاتا ہے تاکہ کمسٹری کا لفظ اس غلط خیال کو نہ
آنے دے اور کیمیا کا لفظ کمسٹری اور کیمیا کے ایک ہونے کا
خیال نہ پیدا کرے۔

لٹریچر یعنی علم ادب اہل زبان کے لئے نہایت وسیع جولانگاہ
ہے۔ اس میں وہ اپنی طبیعت کا زور دکھلاتا ہے۔ اسی کے
ذریعہ سے وہ اپنے دل کی بات دوسرے کے دل میں ڈالتا

ہے۔ اپنی شستہ تقریر اور مناسب الفاظ سے لوگوں کے دلوں
کو جس بات پر چاہتا ہے ابھارتا ہے ان ہی لفظوں سے کبھی
ہنسا دیتا ہے اور کبھی رُلا دیتا ہے۔ پرانے دقیانوسی خیالوں
کو مٹاتا ہے اور نئے نئے خیالات دلوں میں ڈالتا ہے۔ کبھی
واحد کے بدلے جمع اور جمع کے بدلے واحد کے صیغے بولتا ہے
کبھی حاضر کو غائب اور غائب کو حاضر کہہ دیتا ہے۔ کبھی ترکیب
جملہ کی دوسری زبان کی ترکیب پر گھڑ دیتا ہے۔ اور اس سب
میں ایک لطف اور ایک قسم کا مزہ رکھتا جاتا ہے۔ اگر وہی
چال وہ چلے جو اہل زبان نہیں ہے تو سینکڑوں ٹھوکریں کھاتا ہے
یہ مطلب نہیں ہے کہ اہل زبان جو کہے سو صحیح ہے اور غیر اہل زبان
وہ چال چلے تو غلط ہے۔ نہیں درحقیقت اس کا کہنا صحیح اور اس
کا بولنا غلط ہوتا ہے اور اہل زبان ہی اس میں تمیز کر سکتا ہے۔

دوسری زبان کے لفظوں کو اپنی زبان میں لانا کبھی عبارت
کا لطف بڑھانے کے لئے ہوتا ہے کبھی اپنی زبان کو وسعت دینا
اور نئے لفظوں کو اس میں داخل کرنا مقصود ہوتا ہے۔ کبھی
سامعین کو مطلب کی طرف زیادہ متوجہ کرنے کے لئے بولا جاتا
ہے۔ کبھی اس مطلب کی عظمت جتانے کو کہا جاتا ہے جو عظمت
اس مرادف لفظ سے جو اسی زبان میں مستعمل ہے دل میں نہیں
بیٹھتی۔ مثلاً بعضے اہل زبان تحریر و تقریر میں مناسب موقع پر جس

کی مناسبت کو اہل زبان ہی جان سکتے ہیں جنٹلمین کا لفظ بولتے ہیں۔ اگر وہ اس کی جگہ شریف یا شریفوں کا لفظ بولیں تو اس لفظ یا مطلب کی عظمت خاک میں مل جاتی ہے۔ اس لئے کہ ہماری زبان اور عام استعمال میں لفظ شریف کا ذلیل ہو گیا ہے۔ اس سے بجز اس خیال کے کہ اس کی حسب و نسب میں کچھ نقصان نہیں ہے۔ شیخ سید۔ مغل۔ پٹھان ہے اور کوئی خیال پیدا نہیں ہوتا مگر اس لفظ کے بولنے والا اس خیال سے زیادہ تر وسیع اور اعلیٰ خیال دل میں بٹھانا چاہتا ہے۔ وہ اس لفظ سے ایسا شخص بتانا چاہتا ہے جو رذیل آدمیوں کی بہ نسبت خاندان میں، تعلیم میں، حیثیت میں اطوار میں افضل ہو۔ اس کی تعلیم و تربیت اس کا چال چلن اچھا ہو۔ نیک اور خوش اخلاق ہو۔ وہ ہر بات میں جو اس سے متعلق ہو حلیم ہو۔ چال چلن میں حوصلہ و فراخی میں خواہش اور ارادہ میں حلیم ہو۔ ایسا ہونا تعلیم سے شروع ہوتا ہے اور پڑھنے کو گنا اور نیک صحبت میں بیٹھنا اس کو پورا کرتا ہے۔ اگرچہ شریف کے بھی یہی معنی ہونے چاہئیں مگر چونکہ اس کا استعمال ایک خاص بات پر ہو گیا ہے تو یہ پورا پورا خیال اس لفظ سے دل میں نہیں آتا۔ پس ایک مہذب قوم اپنی زبان ان خیالوں کو دل میں ڈالنے کے لئے اپنی زبان کو وسعت دیتا ہے اور دوسری زبان کا نیا لفظ اپنی زبان میں ملاتا ہے تاکہ نئے لفظ کے ساتھ

نیا خیال دل میں پیدا ہو۔ یہی حال اس قسم کے اور لفظوں کا
اگر ہم ان سب کی تفصیل لکھیں تو ہمارا یہ آرٹیکل لغت یا اصطلا
کی ایک کتاب ہو جاوے۔ اسی نمونہ سے ہمارے ہم وطن خیا
کر سکیں گے کہ ہماری قوم کو اپنی زبان کی نسبت بھی کیا کیا
ہے۔ اور ان لغو خیالات کو چھوڑیں گے کہ وہ شخص تو انگریزیت
بھرتا ہے۔ انگریزی ہی لفظ بولتا ہے۔ اپنی واقفیت کا ر
انگریزوں کی جتاتا ہے۔ کیوں کہ کسی جنٹلمین کو ایسے ذلیل خیال
کسی جنٹلمین کی نسبت کرنے زیبا نہیں۔

۴۔ تعلیم

میں سمجھتا ہوں کہ انسان کی روح بغیر تعلیم کے کھنگرے سنگ م
کے پہاڑ کی مانند ہے کہ جب تک سنگ تراش اس میں ہاتھ
نہیں لگاتا، اس کا دھندلا اور کھردرا پن دور نہیں کرتا، اس کو
خراش تراش کر سڈول نہیں بناتا، اس کو پالش اور جلا سے
آراستہ نہیں کرتا، اسی وقت تک اس کے جوہر اسی پر چھپے رہتے
ہیں، اور اس کی خوشنما تراشیں اور دلربا رنگتیں اور خوبصورت
بیل بوٹے ظاہر نہیں ہوتے۔ یہی حال انسان کی روح کا ہے۔
انسان کا دل کیسا ہی نیک ہو، مگر جب تک اس پر عمدہ تعلیم کا

اثر نہیں ہوتا، اس وقت تک ہر ایک نیکی اور ہر ایک قسم
کے کمال کی خوبیاں جو اس میں چھپی ہوئی ہیں، اور جو بغیر اس
قسم کی مدد کے نمود نہیں ہو سکتیں، ظاہر نہیں ہوتیں۔
ارسطو نے تعلیم کے اثر کو مجسم مورتوں کے بنانے کی تشبیہ
میں نہایت خوبصورتی سے بیان کیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ موہنی
مورت ایک پتھر کے ڈھوکے میں چھپی ہوئی ہوتی ہے، مگر مورت
بنانے کا ہنر صرف فضول چیزوں کو اس میں سے گھڑ دیتا ہے
مورت تو پتھر ہی میں ہوتی ہے، مگر آذر صرف اس کو نمود کر دیتا
ہے، جو نسبت کہ مورت گھڑنے والے کو اس پتھر کے ڈھوکے
سے ہے، وہی نسبت تعلیم کو انسان کی روح سے ہے۔
بڑے بڑے حکیم اور عالم، ولی و ابدال، نیک و عقلمند، بہادر
و نامور، ایک گنوار آدمی کی سی صورت میں چھپے ہوئے ہوتے
ہیں، مگر ان کی یہ تمام خوبیاں عمدہ تعلیم کے ذریعے سے ظاہر ہوتی
ہیں۔ جب میں جاہل اور وحشی قوموں کے حالات پڑھتا ہوں،
تو ان نیکیوں سے جو ان میں ہیں مگر ناشائستہ، اور اس دلیری
اور جرأت سے جو ان میں ہے، مگر خوفناک، اور اس استقلال
سے جو ان میں ہے مگر بے ڈھنگا، اور اس دانائی اور عقلمندی سے
جو ان میں ہے مگر جانوروں کے سے مکر و فریب سے ملی ہوئی،
اور اس صبر و قناعت سے جو ان میں ہے، اور گویا ناامیدیاں

ہی ان کی امیدیں ہیں، نہایت خوش ہوتا ہوں، سچ ہے کہ انسان کے دل کے جوش مختلف طرح پر کام کرتے ہیں، اور جس قدر علم و فن عقل کی ہدایت ان کو ہوتی ہے، اور جس قدر کہ عقل ان جوشوں کو درست کرتی ہے، اسی قدر مختلف طور پر ان سے کام ہوتے ہیں۔

امریکہ کے حبشی غلاموں کا جب یہ حال سنتے ہیں کہ اپنے آقا کے مرنے پر، یا ایک کام سے پھر کر دوسرے کام کئے جانے پر، جنگلوں کے درختوں میں لٹک کر اپنی جان دے دیتے ہیں، یا ایک ہندو عورت اپنے خاوند کی لاش کے ساتھ زندہ جل کر ستی ہو جاتی ہے، تو کون شخص ہے جو اُن کی وفاداری اور محبت کی تعریف نہ کرے گا، گو کہ کیسے ہی ناشائستہ اور نامہذب طور سے ظاہر ہوتی ہے۔ اس قسم کی اور وحشی قوموں کے دلوں میں بھی نہایت عمدہ عمدہ باتیں پائی جاتی ہیں، گو وہ وحشی پنے کی حالت میں کیوں نہ ہوں۔ لیکن اگر اُن کی مناسب طور سے اور عمدہ تعلیم سے درستی کی جاوے، تو وہی وحشیانہ نیکیاں کس قدر ترقی پا سکتی ہیں، اور کیسے عمدہ کام اور مہذب و شائستہ نیکیاں ان سے پیدا ہو سکتی ہیں!

مجھ کو اسی بات کا رنج ہے کہ میں اپنی قوم میں ہزاروں نیکیاں دیکھتا ہوں، پر ناشائستہ، اُن میں نہایت دلیری اور جرأت پاتا

ہوں، پُر خوفناک، ان میں نہایت قوی استقلال دیکھتا ہوں، پر بے ڈھنگا، ان کو نہایت دانا اور عقلمند پاتا ہوں، پر اکثر مکر و فریب اور زور سے ملے ہوئے، اُن میں صبر و قناعت بھی اعلیٰ درجہ کی ہے، مگر غیر مفید اور بے موقع، بس میرا دل جلتا ہے اور یہی خیال کرتا ہوں کہ اگر یہی ان کی عمدہ صفتیں عمدہ تعلیم و تربیت سے آراستہ ہو جاویں، تو دین و دنیا دونوں کے لئے کیسی کچھ مفید ہوں۔

تعلیم سے ہماری مراد، موافق عرف عام کے، لکھنا پڑھنا سیکھنے سے ہے، ہر زمانہ میں لاکھوں کروڑوں آدمی مختلف مقاصد سے لکھنا پڑھنا سیکھتے رہے ہیں۔

عام مقصد، جس کے سبب سے تعلیم پر توجہ ہوتی ہے، خواہ تعلیم پانے والے خود اس پر متوجہ ہوں یا اطفال کے مربیوں نے اطفال کی تعلیم پر توجہ کی ہو، یہ ہے کہ ان کے ذہن میں یہ بات سمائی ہوئی ہوتی ہے کہ ایک جاہل کندہ ناتراش سے لکھا پڑھا آدمی زیادہ بہتر ہوتا ہے، اور وہ تعلیم جس درجہ کی ہوتی ہو زندگی کے کاروبار میں اس کے لیے نہایت مفید اور کار آمد ہوتی ہے۔

ان تعلیم پانے والوں میں لاکھوں آدمی تو ایسے ہوتے ہیں کہ ادنیٰ درجہ تعلیم تک پہونچ کر، اور کچھ متوسط درجہ کی تعلیم تک پہنچ کر رہ جاتے ہیں، اور چند ایسے ہوتے ہیں، کہ متوسط درجہ کی تعلیم سے

آگے بڑھتے ہیں، اور اپنے مذاق کے موافق علم کی شاخوں میں
سے کسی شاخ کی تکمیل پر مائل ہوتے ہیں۔ کوئی شاعر بننا چاہتا ہے
کوئی ادیب، کوئی فلسفہ میں ترقی کرتا ہے، کوئی ریاضیات میں،
اور کوئی دینیات میں، علیٰ ہذا القیاس، مگر ہر ایک کے ساتھ حصول
معاش کا خیال لگا رہتا ہے، اور جو کچھ حاصل کرتا ہے یا کرنا چاہتا
ہے، اس کو ذریعۂ حصولِ معاش ضرور سمجھتا ہے۔
تعلیم بغیر اس کے کہ اس کے حاصل کرنے کے لئے کوئی زبان
اختیار کی جاوے، غیر ممکن ہے۔ جس زمانہ میں جس زبان کا عروج
ہوتا ہے، وہی زبان اس کے لئے اختیار کی جاتی ہے۔ اس زمانہ
کی تعلیم میں، جو بذریعہ انگریزی زبان کے ہوتی ہے، اور اگلے زمانہ
کی تعلیم میں، جو بذریعہ عربی زبان کے ہوتی تھی، یہ فرق ہے کہ اگلے
زمانہ میں تعلیم کا سامان ایسا موجود اور مہیا تھا کہ ہر شخص، ہر علم کی کسی
شاخ میں، یا شاخوں میں، اس زمانہ کے موافق اعلیٰ درجہ کی تعلیم
پاتا اور اس فن کا ماسٹر ہونا چاہیئے، تو ہو سکتا تھا، اور سوسائٹی جو
اس زمانہ میں موجود تھی، اس تعلیم کی مدد کرتی تھی، اور اس پر عمدہ
اخلاقی اثر ڈال کر اس کو اس سوسائٹی کے لائق کر دیتی تھی، اگلے
زمانہ کی سوسائٹی بلحاظ اخلاق اور حسن معاشرت کے ایسی عمدہ
تھی، کہ اس میں کوئی نقص اس زمانہ میں نہیں نکالا جا سکتا تھا، مگر افسوس
ہے کہ زمانہ کے انقلاب کے ساتھ وہ قائم نہ رہی!

اس زمانہ کی تعلیم جو انگریزی زبان کے ذریعہ سے ہندوستان میں ہوتی ہے، اس کے لئے کوئی ایسا سامان نہیں ہے کہ جو شخص کسی علم کی شاخ میں اعلیٰ درجہ کی تعلیم پانا چاہے، تو اعلیٰ درجہ کی تعلیم پاکر اس فن کا ماسٹر ہو سکے۔ ہندوستان میں اعلیٰ التعلیم دینے والی وہ یونیورسٹیاں ہیں جو ہندوستان میں موجود ہیں۔ وہ بلاشبہ بی۔ اے اور ایم۔ اے کی ڈگریاں دیتی ہیں۔ مگر اس تعلیم کو اعلیٰ التعلیم کہنا ہمارے نزدیک محض ناواجب ہے، بلکہ وہ علم کی بعض شاخوں میں اوسط درجہ کی تعلیم ہے اور بعض شاخوں میں ادنیٰ درجہ کی تعلیم کا رتبہ رکھتی ہے۔

ہماری رائے میں اخلاقی تعلیم صرف کتابوں کی تعلیم سے حاصل نہیں ہوتی، بلکہ عمدہ سوسائٹی اس کی تعلیم دیتی ہے، ہندوستان میں جو قدیم سوسائٹی علماء اور نیک خداپرست، رحم دل، نیک خصلت لوگوں سے مرکب تھی، وہ مدت ہوئی کہ مردہ ہو گئی ہے، اور نئی سوسائٹی، جو زمانہ حال کے موافق ہو، اب تک قائم نہیں ہوئی، تکمیل نہیں ہوئی ہے۔

دماغی تعلیم جس کا ہم نے اوپر ذکر کیا، کچھ شبہ نہیں ہے کہ انسان کو انسان اور اس کی عقلی اور دماغی قوتوں کے کامل اور اس کے اخلاق کو عمدہ بنانے میں بہت کچھ مدد کرتی ہے، مگر جب مسئلہ حصول معاش پر نظر کی جاتی ہے، تو لوگ کہتے ہیں کہ یہ یقینی

امر ہے کہ محض علمی پیشوں میں حصول معاش کی ذرا بھی گنجائش باقی نہیں ہے، اور اس لئے ان کا اس طرف خیال جاتا ہے کہ حرفت اور فن کی تعلیم کو جیسے سائنس اور ٹیکنیکل ایجوکیشن سے تعبیر کیا جاتا ہے، زیادہ وسعت دی جاوے۔

ٹیکنیکل ایجوکیشن کے معنی تو ہم آج تک نہیں سمجھے کہ اس سے کیا مراد ہے اگر اس کی مراد حرفوں کی تعلیم سے ہے، جیسے لوہاری نجاری، نوربافی وغیرہ تو اس کی ضرورت تو ہم ہندوستان میں بہت کم پاتے ہیں۔ اگر یورپ کو یا اور کسی ملک کو اس باب میں تفوق ہے، تو وہ صرف اس وجہ سے ہے کہ جو کام ہندوستان میں ہاتھوں سے ہوتا ہے، وہاں ملکوں میں کلوں کے ذریعہ سے ہوتا ہے۔ مگر کلیں قائم کرنے والے وہ لوگ نہیں ہیں جو ان میں کام کرتے ہیں، بلکہ کلوں کو قائم کرنے والی ایک جدا جماعت ہے سائنس بلاشبہ نہایت عمدہ چیز ہیں، اور سائنس کا جاننے والا آج کل کے زمانہ میں قریب قریب ہر حرفت پر پورا پورا اختیار اپنے ہاتھ میں رکھتا ہے، اور معاش حاصل کرنے کے لئے ایک نہایت عمدہ ذریعہ اس کے پاس ہوتا ہے، جیسا کہ یورپ کے ملکوں میں دیکھا جاتا ہے۔

۵۔ تعلیم و تربیت

تعلیم و تربیت کو ہم معنی سمجھنا بڑی غلطی ہے، بلکہ وہ جدا جدا دو چیزیں ہیں۔ جو کچھ انسان میں ہے، اس کو باہر نکالنا انسان کو تعلیم دینا ہے، اور اس کو کسی کام کے لائق کرنا، اس کا تربیت کرنا ہے، مثلاً جو قوتیں کہ خدا تعالیٰ نے انسان میں رکھی ہیں ان کو تحریک دینا اور شگفتہ و شاداب کرنا انسان کی تعلیم ہے، اور اس کو کسی بات کا مخزن اور مجمع بنانا اُس کی تربیت ہے۔

انسان کو تعلیم دینا درحقیقت کسی چیز کو باہر سے اس میں ڈالنا نہیں ہے، بلکہ اس کے دل کی سوتوں کا کھولنا اور اندر کے سرچشمے کے پانی کو باہر نکالنا ہے، جو صرف اندرونی قویٰ کو حرکت میں لانے، اور شگفتہ و شاداب کرنے سے نکلتا ہے، اور انسان کو تربیت کرنا، اس کے لئے سامان کا مہیّا کرنا، اور اس سے کام کا لینا ہے، جیسے جہاز تیار ہونے کے بعد اس پر بوجھ لادنا اور حوض بنانے کے بعد اس میں پانی کا بھرنا۔ پس تربیت پانے سے تعلیم کا پانا بھی ضرور نہیں ہے۔ تربیت چاہو جتنی کرو! اور اس کے دل کو تربیت کرتے کرتے منہ تک بھر دو! مگر اس سے

دل کی سرچی سوتیں نہیں کھلتیں، بلکہ بالکل بند ہو جاتی ہیں۔
اندرونی قویٰ کو حرکت دئے بغیر تربیت تو ہو جاتی ہے، مگر تعلیم کبھی نہیں ہوتی۔ اس لئے ممکن ہے کہ ایک شخص کی تربیت تو بہت اچھی ہو، اور تعلیم بہت بُری یہی حال ٹھیک ٹھیک ہم مسلمانو کے عالموں اور تربیت یافتہ لوگوں کا ہے، کہ تربیت تو نہایت اچھی ہے، اور تعلیم کچھ نہیں۔ ظاہر میں دیکھو، تو طمطراق بہت کچھ، مگر جب اصلیت ڈھونڈھو، تو کچھ نہیں۔ بھاری بھرکم تو عمامہ و دستار، جبہ و کرتہ سے بہت کچھ، مگر دل کی اور اندرونی قویٰ کی شگفتگی دیکھو، تو کچھ بھی نہیں۔

نہایت عمدہ قول ہے کہ کتابوں کا پڑھا دینا تو تعلیم کا نہایت ادنیٰ اور سب سے زیادہ حقیر جزو ہے، بلکہ اس قسم کے بہت سے پڑھنے سے جس میں اندرونی قویٰ کی تحریک اور شگفتگی نہ ہو، جس قدر دل کے قویٰ کمزور اور ناکارہ ہو جاتے ہیں ایسے اور کسی چیز سے نہیں ہوتے۔

ہم اپنے ہاں کے عالموں کا حال بالکل یہی دیکھتے ہیں: کہ ان کے روحانی قویٰ بالکل نیست و نابود ہو جاتے ہیں، اور صرف باقی بک بک یا تکبر و غرور، اور اپنے آپ کو بے مثل و نظیر، قابل ادب، سمجھنے کے اور کچھ باقی نہیں رہتا، زندہ ہوتے ہیں، مگر دلی اور روحانی قویٰ کی شگفتگی کے اعتبار سے بالکل مردار ہوتے ہیں، کتابیں پڑھتے

ہیں، اور جس قدر عمدہ کتابیں افراط سے بہم پہونچیں اُن کو اور زیادہ پڑھتے ہیں، اور ان سے تربیت حاصل کرتے ہیں، اور ایسے بیل کے مانند ہو جاتے ہیں جو برابر چرتا ہے، اور پھر بھی چراگاہ ہی میں رہنے کی خواہش کرتا ہے۔ پس کتابیں پڑھ لینے سے انسانیت نہیں آجاتی، بلکہ وہ کتابی علم خود اُن پر بوجھ ہوتا ہے۔

ہمارا مطلب یہ ہے کہ تمام خرابیوں کی جڑ جو ہم پر نازل ہیں یہی ہے کہ ہم نے اپنے دل کو اور اپنے اندرونی قوی کو، بالکل خراب کر دیا ہے۔ علم جو حاصل کرتے ہیں، وہ بھی بعوض اسی کے کہ روحانی قوی کو سرسبز و شاداب کرے، ان کو پژمردہ کر دیتا ہے، اور ہمارے قوی کو جو درحقیقت سرچشمے تمام نیکیوں کے ہیں، بالکل کمزور اور ناکارہ کر دیتا ہے، اور ہماری حالت تمام معاملات میں، کیا دین کے کیا دنیا کے، خراب ہوتی ہوئی چلی جاتی ہے۔

بس ہم کو اپنے پر رحم کرنا چاہئے، اور ایسی تعلیم کو اختیار کرنا چاہئے جو اندرونی قوی کو شگفتہ اور شاداب کرے، اور دل کی سوتوں کو کھول کر سرچشمہ سے پانی باہر نکالے، جس سے ہماری زندگی سرسبز و شاداب ہو۔

۶- باہمی اتحاد اور تعلیم

مدرسہ گورداسپور پنجاب میں ۲۷ جنوری ۱۸۸۴ء کو یہ لکچر دیا

جناب پریسیڈنٹ صاحب و دیگر بزرگان و طالبعلمان۔

اس وقت میں آپ صاحبوں کی خدمت میں اس لائق نہیں ہوں
کہ اس حال میں جو ایک تعلیم گاہ ہے جس میں لائق ہیڈ ماسٹر اور
ٹیچر موجود ہیں۔ اور بھی بہت سے لائق لوگ تشریف رکھتے ہیں تعلیم
و تربیت کے باب میں کچھ کہنے کی جرأت کروں۔ مگر میں اپنے خیال
نسبت تعلیم و اتحاد کے جو کچھ کہ ہیں۔ اس لئے بیان کرنے کی جرأت
کرتا ہوں کہ جو کچھ اس میں غلطیاں ہوں گی اُن کی اصلاح ہوگی۔
اے صاحبو! ہمارے ملک ہندوستان میں جو کہ غالباً صدیوں
سے ان دو قوموں سے جو ہندو اور مسلمان کے لفظ میں تقسیم کی
گئی ہوں آباد ہیں۔ اُن کے بزرگوں کی عظمت اور فضیلت اور ناموری
ایسی نہ تھی جو بھلا دی جائے۔ ہندوؤں کے بزرگ جس قدر کہ انھوں
نے تمام علوم ریاضیات۔ ہندسہ حساب۔ لاجک۔ فلاسفی نیچرل
سائنس میں ترقی کی۔ آج تک اُن کی یادگار نشانیاں ہیں جس سے
اُن کی اولاد کو فخر ہے۔ مسلمان بعد کو اس ملک میں آکر آباد ہوئے
وہ بھی اپنے بزرگوں کی عمدہ تحریرات عمدہ تالیفات اور تصنیفات

پر فخر کرتے ہیں۔ انھوں نے علم کی ہر شاخ میں ترقی دی۔ گو یہ علم
یونانیوں سے حاصل ہوئے۔ مگر انھوں نے اُس کو ایسے درجے تک
ترقی پر پہنچایا کہ یونان اور انگلستان دونوں کو اُن کی شاگردی کا
فخر حاصل ہوا۔ یہ باتیں یقیناً بہت سے لڑکے اور جوان یاد کرکے فخر کرتے
ہوں گے۔ مگر اے دوستو! بزرگوں کی یاد کرکے فخر کرنا اور خود کچھ
نہ ہونا حمیت کے خلاف ہے۔ بلکہ اپنی جہالت اور کم علمی سے اُن
بزرگوں کے نام کو بھی بٹہ لگاتا ہے۔ نہایت افسوس ہے اُن دونوں
قوموں پر جن کے بزرگ ایسے گذرے اور جہالت میں پڑکر بزرگوں
کو بھی بدنام کریں۔ اس زمانے میں علم کا بہت چرچا ہو رہا ہے۔
لیکن ہم کو تعلیم کے معاملے میں اوّل غور کرنا چاہئے کہ کیا چیز ہے جس
کو ہم سیکھیں اور کیا چیز ہے جس کا سیکھنا ہم کو مفید نہ ہوگا۔ میں اُس
بزرگ زبان کو جو سنسکرت ہے جس کو ہمارے ملک کے باشندوں
کا ایک حصہ عزیز رکھتا ہے اور واقعی وہ اپنا ثانی بھی نہیں رکھتی ہے
یا اُس مقدس زبان کو جو عربی کہلاتی ہے جس کو میں دل سے مقدس
سمجھتا ہوں اور جو اس قابل بھی ہے کہ تمام علوم اور سائنس اُس میں
لائے جاسکتے ہیں۔ دل سے پسند کرتا ہوں مگر باوجود ان سب خوبیوں
کے جو اُن زبانوں میں ہیں۔ سوال یہ ہے کہ ہم کو کیا کرنا چاہئے۔ اگر
ہم بغیر خیال ضرورت کے تعصب یا نیچرل خواہش سے اپنی اُن دونوں
زبانوں کو تعلیم کا ذریعہ قرار دیں تو یقین کرنا چاہئے کہ جس چیز کے

حاصل کرنے کی ہم کو ضرورت ہے اُس کو چھوڑ بیٹھیں گے۔

میرا مطلب یہ نہیں ہے کہ اُن مقدس اور پُرانی زبانوں کو بالکل چھوڑ بیٹھیں۔ سمجھنے کی یہ بات ہے کہ بالفعل ہم کو ضرورت کس چیز کی ہے۔ اور کون زبان ہم کو علوم کے اعلیٰ مطالب کی طرف پہنچا سکتی ہے۔ اُس کے جواب میں یہ کہوں گا کہ انگلش لینگوج ایک زمانہ تھا کہ ہمارے ہاں کی کتابیں علوم و فنون سے بھری ہوئی تھیں۔ مگر اب دیکھنا چاہیئے کہ علوم و فنون نے کہاں تک ترقی کی۔ میں سمجھتا ہوں کہ جن علوم کے بیج ہمارے بزرگوں نے بوئے تھے وہ اب برومند اور تناور درخت ہوگئے ہیں اور اُن میں اب ایسے پھل پھول لگے ہیں اور ایسی خوشنما شاخیں نکلی ہیں اور ایسے لذیذ میوے لگے ہیں کہ وہ ایک نئے درخت معلوم ہوتے ہیں۔ علوم جدیدہ جو بالکل نئے ہوں اور جن کا وجود مطلقاً ہمارے بزرگوں کے زمانے میں نہ پایا جاتا ہو۔ واقعی تھوڑے ہیں اور زیادہ وہی ہیں جو اگلے بزرگوں کے پاس تھے۔ مگر حقیقت میں اُس وقت وہ بیج تھے اور اب وہ پھلدار درخت ہوگئے ہیں۔ پس اب ہمارا اُن بیجوں پر فخر کرنا اور اُن بارآور درختوں کے ہمارے سے فائدہ نہ اُٹھانا اور ان لذیذ میووں کے ذائقہ سے محروم رہنا ہم کو نہ کچھ فائدہ دینے والا ہے نہ کچھ عزت بخشنے والا۔ اگر ہم ہی علوم میں ترقی کرتے جائیں تو اُن بیجوں کا جو ہمارے باپ دادا نے بوئے تھے ہم کو فائدہ حاصل ہوگا۔ نہیں تو ہم پرانے کہنہ

سے کے ساتھ تعلیم کا فائدہ نہ اُٹھائیں۔

مگر اے دوستو! میری رائے اور میرا خیال یہ ہے کہ کوئی گورنمنٹ ہر ایک قوم کی تعلیم کا ذمہ اپنے اوپر نہیں لے سکتی ہے۔ بلکہ میں مضبوطی سے اس رائے پر ہوں کہ ممکن نہیں کہ گورنمنٹ اپنی تمام رعایا کی تعلیم کر سکے۔ اس سے بھی سخت میری رائے یہ ہے کہ کوئی قوم جس کو اپنے بچوں اور قوم کی تعلیم کی خواہش ہو، جب تک وہ تعلیم کو اپنے ہاتھ میں نہ لے اُس کی خواہش کا پورا ہونا غیر ممکن ہے جو کچھ مجھے افسوس ہے یہی ہے کہ ہماری قوم کو ہر جگہ یہی خواہش ہے کہ گورنمنٹ اسکول قائم ہو۔ مگر یہ خواہش کسی طرح پوری نہیں ہوسکے گی کیونکہ گورنمنٹ کی آمدنی بہ لحاظ اُس کے اور مصارف کے کسی قوم کی تعلیم کے واسطے کافی نہیں ہوسکتی ہندوستانیوں کو ترقی اُس وقت ہوگی جب وہ اپنے باہمی چندہ۔ اپنے انتظام اپنی قوت سے بلامداخلت گورنمنٹ اور اُس کے افسروں کے اپنی خودسری اور اپنی مرضی کے موافق اپنے بچوں کی تعلیم کریں۔

اے دوستو! تم اس بات کا خیال کرو کہ گورنمنٹ جو ایسی وسیع مملکت ہندوستان میں حکومت کرتی ہے جس میں مختلف قومیں مختلف اغراض کے لوگ بستے ہیں۔ وہ کسی ایک قوم کی طرفداری یا بہتری کی کوشش نہیں کر سکتی۔ اُس کو لازم ہے کہ اُس کے قواعد تعلیم ایسے ہوں جو یکساں سب سے متعلق ہوسکتے ہوں۔ اور جیسا کہ میں نے

بیان کیا کہ قوم کی ضرورتیں مختلف ہیں پس گورنمنٹ اپنی دور اندیشی کے قاعدے سے کسی خاص فرقے کی خاص ضرورتوں کو پورا نہیں کرسکتی۔ اور ہرگز نہیں کرسکتی۔ ایک بات خیال کرنے کی ہے کہ انگریزی گورنمنٹ کی کچھ ہی تعریف کی جاتی ہو کچھ ہی عمدگی اُس میں ہو مگر سب سے زیادہ عمدگی جو اُس میں ہے وہ یہ ہے کہ وہ تعلیم مذہبی سے بالکل علیحدہ ہے۔ اگر گورنمنٹ کسی مذہبی تعلیم میں دخل دے گو وہ نیک نیتی اور نیک دلی ہی سے کیوں نہ ہو ہم کو شبہ میں ڈالے گا۔ اور بہت بڑا خیال ہمارے دل میں پیدا ہوگا اس سبب سے بچوں کی تعلیم مذہبی گورنمنٹ کی مصلحت اُس کی پالیسی اور اُس کے نظام حکومت کے بالکل خلاف ہے۔ اگر گورنمنٹ کے اسکول ہماری دنیوی تعلیم کے واسطے کافی ہوں تب بھی ایک ضروری جزو مذہبی تعلیم کا رہا جاتا ہے۔ پس ہمارے ہم وطن اور ہم قوم لوگوں کو گورنمنٹ پر بوجھ تعلیم کا نہ ڈالنا چاہیئے۔ اور تعلیم کو اپنے ہاتھ میں لینا چاہیئے۔ گورنمنٹ کا یہ فرض ہے کہ وہ ہم کو مدد دے۔ اس سے زیادہ گورنمنٹ سے مانگنا بے غیرتی ہے۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے گورنمنٹ ہر اسکول میں مدد دینے کو تیار ہے۔ ہم کیوں کہیں کہ فلاں قسم کی تعلیم ہم کو چاہیئے اور فلاں قسم کے مدرسے یا کالج ہماری تعلیم کے لئے ضروری ہیں۔ کیوں نہیں تعلیم کو ہم لوگ اپنے ہاتھ میں لیں۔ اور جس طرح کی تعلیم کی ضرورت سمجھیں۔ اُس طرح کی تعلیم دیں۔ کیمبرج یونیورسٹی میں

ابھی ایک لیڈی نے ایک نیا کالج قائم کیا ہے۔ اُس فیاض لیڈی نے اس کالج کے لئے اپنے پاس سے اٹھارہ لاکھ روپے دئے ہیں جو یہاں کے حساب سے بیس لاکھ ہوتے ہیں۔ میرے خیال میں ہمارے ملک کے ہر ضلع و ہر قصبے کے لوگ مدرسہ قائم کر سکتے ہیں یہاں کی مردم شماری کچھ ہی ہو۔ مگر دو روپیہ اوسط فی کس دینے سے یہاں کے لوگ لاہور کالج سے زیادہ عمدہ ایک کالج گورداسپور میں قائم کر سکتے ہیں لیکن ہمت اور ارادے کی کمی ہے۔

تعلیم کے متعلق میں اس وقت یہ بحث کرنا نہیں چاہتا کہ کون کون علوم اور فنون عمدہ ہیں اور کون کون تعلیم میں شامل ہونے چاہئے یہ بہت بڑا وسیع میدان ہے اور بہت لوگوں نے اس پر رائے دی ہے۔ اس وقت میں اُس تعلیم کا ذکر کروں گا جس کو میں ادنیٰ درجہ کی تعلیم کہتا ہوں۔ اور جس کی عموماً ملک کے لوگوں کو ضرورت ہے۔ وہ یہ ہے کہ انگریزی زبان عمدہ طور پر جاننا۔ عمدہ گفتگو کرنا۔ انگریزی اخباروں کا بخوبی پڑھنا۔ قانون انگریزی کو خوب سمجھنا۔ اپنے خیالات کو انگریزی تحریری میں اچھی طرح ظاہر کر سکنا۔ اسی تعلیم کی اشد ضرورت ہے۔ مگر اسی کے ساتھ یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ تعلیم سے تربیت جدا نہیں ہو سکتی ہے۔ اگر ہمارے ملک کے لڑکے اس قدر تعلیم پا جائیں اور ایسی تحریر کر سکیں جس سے وہ لارڈ میکالے کا خطاب پا سکیں اور تربیت اُن میں نہ ہو تو وہ کسی کام کی نہیں۔

لارڈ میکالے میرے خیال میں وہ شخص ہے جس نے ہندوستان میں بھلائی کے درخت کا یا یوں کہو کہ علم کے درخت کا بیج بویا۔ کوئی گورنر جنرل اور کوئی وائسرائے ہندوستان میں ایسا نہیں گذرا جس نے لارڈ میکالے سے زیادہ ہندوستان کو بھلائی پہنچائی ہو۔ گو یقیناً اُس نے جو کچھ کیا اپنی گورنمنٹ کی خیر خواہی اور بھلائی کے لئے کیا۔ مگر اُسی کے ساتھ اصلی خیر خواہی اور بھلائی کی اصلی جان اُس نے ہمارے ملک میں بھی ڈال دی۔

اے دوستو! تربیت اور تعلیم دو چیزیں ہیں۔ صرف تعلیم سے آدمی انسان نہیں بنتا بلکہ تربیت سے بنتا ہے۔ بولنے میں یوں آتا ہے کہ تعلیم اور تربیت۔ مگر تربیت میری سمجھ میں تعلیم پر مقدم ہے۔ ہماری قوم کے لوگوں کو اس پر خیال کرنا چاہیئے کہ اگر لڑکوں کی تعلیم کا گورنمنٹ کے اسکولوں پر بھروسہ کرتے ہیں تو کیا وہ سمجھتے ہیں کہ وہ تربیت بھی پا سکتے ہیں۔ ہرگز نہیں۔ تعلیم کا اصلی مقصد مارل کی درستی ہے۔ بہت سے تعلیم یافتہ ہیں جن کا طرز اخلاق ایسا خراب ہے جس کو دیکھ کر افسوس ہوتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ کاش وہ بے تعلیم ہی رہتے تو اچھا ہوتا۔ میں تمام ہندوستان میں جہاں تک خیال کر سکتا ہوں اور جن بڑے بڑے شہروں میں پھرا ہوں اور وہاں کے حالات سے واقف ہوا ہوں نہایت زور سے کہہ سکتا ہوں کہ کسی کو اولاد کی تربیت کا خیال نہیں ہے۔

اے عزیزو! سمجھو کہ اگر لڑکے کسی گورنمنٹ اسکول میں پانچ گھنٹے تعلیم پاکر آتے ہیں۔ تو اُن کا باقی حصہ زندگی کا جو بالکل سادہ اور مثل ایک پودے کی نرم شاخ کے ہوتا ہے۔ کہ جس طرح پر چاہو ٹیڑھی یا سیدھی کر سکو کس طرح بسر ہوتا ہے۔ گھر کے نوکروں کی صحبت گلیوں میں بازاری لونڈوں کے ساتھ کھیلنا۔ اُن کی صحبت میں بد اخلاقی کی باتیں سیکھنا اور فحش اور بد اخلاقی کے الفاظ جو وہ لونڈے بولتے ہیں اور بکتے ہیں اُن کو سننا۔ اسی قسم کے غارت کن رذائل میں اُن کی زندگی کا پاک حصہ بسر ہوتا ہے۔ اور بجائے اس کے کہ وہ فرشتہ سیرت ہوتے شیطان سے بدتر ان کے اخلاق ہو جاتے ہیں۔ جب کہ لڑکوں کا چہارم حصہ ماسٹر کے پاس اور اُس سے زیادہ حصہ خراب حالت میں گزرتا ہے تو کیا اس سے اُن کی تربیت اخلاق کی توقع ہو سکتی ہے؟ ہرگز نہیں جو لوگ یہ چاہتے ہیں کہ ہماری قوم اور ہمارے بچے تربیت یافتہ اور مہذب ہوں دوسری قیشن میں عزت پاویں تو اُن کا پہلا فرض یہ ہے کہ تربیت کی فکر کریں۔ میں یہ نہیں کہتا وہ سب کچھ میرے ہی خیال کے موافق کریں۔ تم مجھ کو جانے دو۔ میرے خیال کی پیروی نہ کرو تم خود سوچ کر کوئی تدبیر نکالو۔ دیکھو یہ یورپین بچہ (ایک کم عمر لڑکا جو اُس وقت موجود تھا اُس کی طرف اشارہ کیا) جو اس وقت موجود ہے۔ کیا تم کوئی ایسا بچہ اپنی قوم میں نکال سکتے ہو؟ گو یہ بچہ اب تک

سوسائٹی میں نہیں ملا مگر یہ اپنی ماں کی تربیت سے کیسا نیک عادتوں کا نمونہ ہوا ہے۔ اگلے زمانے میں ہماری اولاد بھی اپنے باپ اور اُس کے دوستوں کی صحبت سے فائدہ اُٹھاتی تھی۔ اُن کے اخلاق حسنہ سیکھتی تھی۔ واقعی وہ بہت اچھا طریقہ تھا۔ مگر وہ تنبایاں جن ڈوری سے بندھی تھیں ٹوٹ گیا۔ اب یہ دوسرا ڈورا اُن کے باندھنے کو ہونا چاہئے۔ اب جو نسلیں موجود ہیں آپ مجھ کو معاف کیجئے گا وہ اس لائق نہیں کہ بچے اُن سے تربیت پا سکیں۔ پس مناسب ہی کہ اولاد کی تربیت کی فکر اور تدبیر کی جائے۔ گورنمنٹ پر بوجھ نہ ڈالئے۔ اُس سے صرف مدد لیجئے جو اُس کا فرض ہے اور جس کے ادا کرنے پر وہ آمادہ ہے۔

اس وقت ہندوستان میں خدا کے فضل سے دو قومیں آباد ہیں اور اس طرح سے ہیں کہ ایک کا گھر دوسرے سے ملا ہے۔ ایک کی دیوار کا سایہ دوسرے کے گھر میں پڑتا ہے ایک آب وہوا کے شریک ہیں۔ ایک دریا یا کنوئیں کا پانی پیتے ہیں۔ مرنے جینے میں ایک دوسرے کے رنج وراحت کا شریک ہوتا ہے۔ ایک دوسرے سے بغیر ملے چارہ نہیں۔ پس کسی چیز کو جو معاشرت سے علاقہ رکھتی ہے اُن دونوں کو علیحدہ علیحدہ رکھنا دونوں کو برباد کر دیتی ہے۔ ہم کو ایک دل ہو کر مجموعی حالت میں کوشش کرنی چاہئے۔ اگر ایسا ہوگا تو سنبھل جائیں گے۔ نہیں تو ایک دوسرے کے اثر سے دونوں

قومیں تباہ اور بگڑ جائیں گی۔

پرانی تاریخوں میں پرانی کتابوں میں دیکھا اور سنا ہوگا اور اب بھی دیکھتے ہیں کہ قوم کا اطلاق ایک ملک کے رہنے والوں پر ہوتا ہے۔ افغانستان کے مختلف لوگ ایک قوم کہے جاتے ہیں۔ ایران کے مختلف لوگ ایرانی کہلاتے ہیں۔ یورپ میں مختلف خیالات اور مختلف مذاہب کے ہیں مگر سب ایک قوم میں شمار ہوتے ہیں۔ گو اُن میں دوسرے ملک کے بھی لوگ آکر بس جاتے ہیں مگر وہ آپس میں مل جُل کر ایک ہی قوم کہلائے جاتے ہیں۔ غرض کہ قدیم سے قوم کا لفظ ملک کے باشندوں پر بولا جاتا ہے۔ گو اُن میں بعض بعض خصوصیتیں بھی ہوتی ہیں۔

اے ہندو اور مسلمانو! کیا تم ہندوستان کے سوا اور ملک کے رہنے والے ہو؟ کیا اسی زمین پر تم دونوں نہیں بستے۔ کیا اسی زمین پر تم دفن نہیں ہوتے ہو۔ یا اسی زمین کے گھاٹ پر جلائے نہیں جاتے؟ اسی پر مرتے ہو اور اسی پر جیتے ہو۔ تو یاد رکھو کہ ہندو اور مسلمان ایک مذہبی لفظ ہے۔ ورنہ ہندو مسلمان اور عیسائی بھی جو اس ملک میں رہتے ہیں۔ اس اعتبار سے سب ایک قوم ہیں۔ جب یہ سب گروہ ایک قوم کہے جاتے ہیں تو ان سب کو ملکی فائدے میں جو ان سب کا ملک کہلاتا ہے ایک ہونا چاہیے۔ اتفاق کی خوبیاں مجھ کو

وہ بھی سمجھتا ہے کہ وہ بُرا کرتا ہے۔ جو لوگ باہم برخلاف ایک دوسرے کے دشمن ہیں وہ بھی جب دل میں سوچتے ہیں تو یہ سمجھتے ہیں کہ یہ ایک بُری بات ہے۔ جو چیز نہایت عمدہ اور خوب ہے وہ اتفاق ہی ہے۔ اتفاق کر کے جو کچھ کیا جائے گا وہی عمدہ ہوگا۔ پس اس امر پر خیال کر کے باہم اتفاق کرنا چاہئے۔ اور اس اتفاق کے ذریعے سے قومی تعلیم اور تربیت حاصل کرنا چاہئے۔ میں کچھ اور زیادہ بیان کرتا۔ مگر آپ مجھے معاف رکھیں کہ میں آج ہی ابھی آیا ہوں۔ اور سفر کی تکان سے خستہ ہو رہا ہوں۔

۷۔ طریقۂ زندگی

قوموں کی عزت یا ذلت، اُن کی رسم و رواج، اور اُن کے طریقۂ زندگی، اور کبھی کبھی ان کے مذہب سے بھی علاقہ رکھتی ہے، تمام قوموں میں بہت سی رسمیں وحشیانہ اور ناتربیت یافتہ زمانہ کی اب تک چلی آتی ہیں۔ مگر تربیت یافتہ قوموں نے ان رسموں کو تراش خراش کر ایسا کر لیا ہے کہ ان میں وحشیانہ پن مطلق نہیں رہا بلکہ نہایت فرحت بخش اور دلکش ہو گئی ہیں، اور ناتربیت یافتہ قومیں اب تک بدستور وحشیانہ طور سے اُن کو برتتی آتی ہیں، اور اسی لئے پہلی قومیں پچھلی کو ذلت اور حقارت کی نظر سے دیکھتی ہیں۔

اکثر قوموں نے قدیم زمانہ میں طریقۂ زندگی بمقتضائے آب و ہوا ہر ایک ملک کے اختیار کیا تھا، جو اکثر نہایت سادہ و حقارت آمیز تھا۔ مگر تربیت یافتہ قوموں نے اس میں اصلاح کرتے کرتے اعلیٰ درجہ کی ترقی اور شائستگی پر پہونچا دیا، اور ناتربیت یافتہ قومیں اسی جہالت میں پڑی رہیں، اور اس لئے بھی قوموں کی آنکھ میں ذلیل و خوار ہیں۔

یہ امر بھی بہت واقع ہوا ہے کہ بسبب نہ ہونے فن و ہنر کے ہر ایک قوم نے جو طریقۂ زندگی بسر کرنے کا اختیار کیا تھا وہ اس زمانہ میں حقیر نہ تھا، مگر حال کے زمانہ میں ذلیل ہو گیا ہے۔ چنانچہ جس قدر فن و ہنر اور صنعت کاری نکلتی آئی، اسی قدر تربیت یافتہ قوموں نے ساز و سامان سے اپنے طریقۂ زندگی کو آراستہ کیا، اور جنھوں نے ایسا نہ کیا، وہ ویسے ہی حقیر و ذلیل ناتربیت یافتہ ہیں۔

طریقۂ زندگی سے قوموں کی ذلت اور عزت کا ہونا ایک ایسا امر ہے جس سے کوئی انکار نہیں کر سکتا، مگر ہم چند مثالوں سے اس کو اور زیادہ واضح کرتے ہیں۔ ہندوستان میں کنجروں کی قوم کو دیکھو جو ایک لنگوٹی باندھے رہتی ہے، اور نہایت میلا بدن اور نجس ہاتھ پاؤں رکھتی ہے، اور نہایت میلے بدبودار برتن استعمال میں لاتی ہے خود ہی اُن کی نہایت کثیف ہے اور طرز کھانے کا بھی ایسا بُرا ہے جسے دیکھ کر گھن آتی ہے۔ پس وہ قوم صرف اپنے طریقۂ زندگی کے ذلیل

ہونے کے سبب ہماری آنکھ میں کیسی ذلیل وخوار معلوم ہوتی ہے۔

اب اُن قوموں کو دیکھو جو اُن سے درجہ بدرجہ طریقہ زندگی کی اصلاح میں ترقی کرتی گئی ہیں، مثلاً چمار جن کا لباس اور طریق زندگی کنجروں سے بدرجہا اچھا ہے۔ وہ ہماری آنکھ میں ایسے ذلیل نہیں ہیں۔ چماروں کی بہ نسبت عام غریب گنواروں کا لباس و طریقہ زندگی بدرجہا نہایت عمدہ اور اچھا ہے۔ وہ ہماری آنکھ میں چنداں ذلیل نہیں۔ ہم کبھی اُن کے گھر بھی جاتے ہیں۔ اُن کے ہاں کا پانی بھی پیتے ہیں۔ ان کے گھر کی پکی ہوئی روٹی بھی کھاتے ہیں، اور کچھ نفرت نہیں کرتے۔ علاوہ ان کے تین قومیں اور ہندوستان میں ہیں جو اپنے تئیں مؤدب ومہذب، تربیت یافتہ وشائستہ سمجھتی ہیں۔

ہندو، مسلمان، انگریز ان تینوں قوموں کا جو طریق لباس، اور طرز زندگی، اور کھانے پینے کی رسم، اور اُٹھنے بیٹھنے کی عادت ہے اس سے تمام لوگ ہندوستان کے بخوبی واقف ہیں، مگر اس میں کچھ شک نہیں کہ ان تینوں قوموں میں سے جس قوم کا طریقہ اعلیٰ ہے، وہ قوم باقی دو قوموں کو ایسا ہی ذلیل، اور نا تربیت یافتہ اور قابل نفرت کے سمجھتی ہے جیسے کہ ہم اپنے سے ادنیٰ قوموں کو سمجھتے ہیں۔

مسلمان اپنی دانست میں اپنے لباس اور اپنی مجلس میں نہایت آراستگی اور شان وشوکت کرتے ہیں، اور اپنے دسترخوانوں کو

انواع انواع طرح کے لذیذ کھانوں سے، اور خوبصورت خوبصورت سونے اور چاندی اور چینی کے برتنوں سے آراستہ کرتے ہیں، مگر جو قوم کہ ان سے بھی زیادہ لباس اور کھانے پینے کے طریق میں زیادہ صفا رکھتی ہے، وہ ان کو اسی حقارت اور ذلت سے دیکھتی ہے۔

جو لوگ کہ چمچے اور کانٹوں سے کھاتے ہیں، اور ہر دفعہ کا بیال اور چھری، کانٹے، چمچے بدلتے جاتے ہیں، جب وہ ہم مسلمانوں کو ہاتھ سے کھاتے ہوئے دیکھتے ہیں تو اُن کو نہایت نفرت و کراہت آتی ہے۔

یہ بات کہی جاتی ہے کہ ہاتھ سے کھانا مسنون ہے، اور اس کو حقیر سمجھنا کفر تک نوبت پہونچا دیتا ہے۔ ہم اس رائے کی صحت و سقم کی بحث سے قطع نظر کر کے اس کو تسلیم کرتے ہیں، اور جو یہ کہتے ہیں کہ ان بزرگوں کی آدھی پیروی کرنا باعثِ ذلت ہے، اگر مسلمان یہ گوارا کریں کہ مرغن کھانے، جس سے ہاتھ اور منہ بھر جاتا ہے، اور یہی امر باعثِ نفرت اور گھن آنے کا ہوتا ہے چھوڑ دیں اور جو کے بن چھنے آٹے کی سوکھی روٹی، ککڑی یا کھجور سے کھا لیا کریں، تو ان بزرگوں کی پوری پیروی ہو گی، اور اس وقت میں کوئی بھی ہاتھ سے کھانے پر نفرت نہ کرے گا۔ مگر یہ نہیں ہو سکتا کہ کھانے تو ہوویں فرعونی اور طریق کھانے کا ہو مسنونی۔

ہم کو خدا کا شکر کرنا چاہیئے کہ اس نے ہم کو اپنی نعمتیں عطا کی ہیں۔ ہم ان کو استعمال کریں، اور عملی طور پر اس کا شکر بجا لاویں اور جبکہ ہم یہ خیال کریں کہ ان شان کی چیزوں کا ہم بنظرِ تکبر و غرور استعمال نہیں کرتے، بلکہ بطور ادائے شکر ولی النعم استعمال کرتے ہیں، اور مسلمانوں کی قوم کی غیر قوموں کی نگاہ میں جو ذلت ہے، اس سے نکالتے ہیں جس میں اسلام کی بھی عزت ہے، تو اس وقت تو ہم چمچہ اور چھری کانٹے سے کھانا مندوبات اور مستحبات سے کم نہیں سمجھتے۔

۸- ہمدردی

کیا دھوکے کی بیچ ہے! کیا بُھلاوے میں پڑے ہیں! جو سمجھتے ہیں کہ دوسروں کی مصیبت میں مدد کرنا، ہمدردی کرنا ہے۔ کیا ہم اُس فائدے میں شریک نہیں؟ نہیں! بے شک واسطہ، یا بلا واسطہ، یا واسطہ در واسطہ شریک ہیں۔ پھر دوسرے کی مدد کرنا کہاں رہا، بلکہ آسائش کے وسیلہ سے اپنی مدد آپ کرنا ہوا۔ اس لئے جو لوگ ہمدردی کرتے ہیں، وہ حقیقت میں اپنی آپ مدد کرتے ہیں، اور جو نہیں کرتے، وہ خود اپنی آسائش کے وسیلہ کو نقصان پہونچاتے ہیں۔

ہمدردی کا لفظ ہمارے خیال کو ایسی امداد کی طرف لیجاتا ہے جو رنج و مصیبت کی حالت میں ہو، لیکن اگر ہم مصیبت کے لفظ کی

اصلی مراد پر غور نہ کریں، تو ضرور غلطی میں پڑیں، عام مفہوم مصیبت کا جو اس لفظ سے ہماری سمجھ میں آتا ہے کوئی مستقل مفہوم نہیں ہے بلکہ ایک نسبتی مفہوم معلوم ہوتا ہے۔ جو چیز کہ ایک کے لئے مصیبت ہو، ممکن ہے کہ دوسرے کے لئے مصیبت نہ ہو۔ وہ عادت روا ستعمال سے ایسی مختلف ہو جاتی ہے کہ مصیبت نہیں معلوم ہوتی۔ وہ کسی جوشش کے سبب سے ایسی بدل جاتی ہے کہ بالکل راحت سمجھ میں آتی ہے۔ بے شک، یہ تمام مفہوم نسبتی ہیں، اور جو اصلی مفہوم ہے وہ ایسی حالت کا ہونا، یا واقع ہونا ہے، جو قدرتی فرحت اور راحت کے برخلاف ہو۔

اس حالت کا ہونا غیر اختیاری حالتوں کا ہونا ہے، اور واقع ہونا، اختیاری حالتوں کا۔ مگر پچھلی حالت، اگر نتیجہ کی لاعلمی یا نقصانات غیر متعدی کے سبب سے ہے تو مجازاً وہ پہلی ہی سے ہے، ورنہ حقیقت میں وہ مصیبت نہیں بلکہ سزا ہے، اور اس لئے اس میں ہمدردی نہیں، بس، اصلی یا اصلی سی مصیبت میں کسی کی مدد کرنا البتہ سچی ہمدردی ہے۔

رحم اور موانست اور ہمدردی شاید نتیجہ میں متحد ہوں، مگر ہر ایک کا منشا مختلف ہے۔ رحم ایک فطرتی نیکی ہے جو ہم جنس اور غیر ہم جنس دونوں کے ساتھ برتی جاتی ہے، موانست کا اثر صرف ہم جنسوں میں پایا جاتا ہے۔ ہمدردی جو عقل کے نتیجوں میں سے ہے، ذی عقل ہی میں ہو سکتی ہے، اور اس لئے صرف انسان ہی میں منحصر ہے۔

پس جس میں ہمدردی نہیں، اس کی انسانیت میں نقصان ہے۔

قدرتی قاعدے کے مطابق ہمدردی کے، بقدر تفاوت اپنی آسائش کے وسیلوں کے، متفاوت درجے ہیں۔ جس طرح کہ باپ بھائی، جورو، بچے، پھر اور درجہ بدرجہ کے رشتہ مند، پھر اپنے ملک کے، پھر اپنے ہم سایہ ملک کے، پھر اس سے دور کے ملک کے باشندے درجہ بدرجہ ہماری آسائش کے وسیلے ہیں۔ اسی طرح اس قادر مطلق کی کامل قدرت نے ہمدردی کے رشتہ کی مضبوطی اور استواری کو بھی درجہ بدرجہ بنایا ہے۔ باپ کو بیٹے سے جو جوش ہمدردی ہے، وہ پوتے سے نہیں، اور جو پوتے سے ہے، وہ پڑوتے سے نہیں۔ اسی طرح یہ رشتہ جتنا کہ بڑھتا جاتا ہے، اتنا ہی گھٹتا جاتا ہے، اور جب وہ اپنے ملک، یا اپنے ہم سایہ ملک، یا اس سے دور کے ملک تک پہونچتا ہے، تو اور بھی پتلا ہو جاتا ہے۔

بعضے کہتے ہیں کہ یہ ایک دھوکا ہے، اور اگر یہ دھوکا نہیں ہے، اور یہ متفاوت درجے قدرتی ہیں، تو انجان بیٹے، اور ان پہچان باپ میں کیوں وہ ہمدردی نہیں؟ حقیقت میں یہ صرف ایک خیال ہے جس سے موانست پیدا ہوتی ہے، اور وہی باعث ہمدردی ہے۔ نفرت جو اس کی ضد ہے، اس کا بخوبی ثبوت فراہم کرتی ہے کہ جب وہ پیدا ہوتی ہے، تو باوجود موجود ہونے قدرتی رشتہ کے کچھ بھی ہمدردی نہیں رہتی۔

بے شک ایسا، یا ایسا سا، ہوتا ہے، مگر اس میں کچھ غلطی بھی ہے۔ قریب تو رشتہ والا بہ نسبت دور کے رشتہ والے کے بلا شبہ ہم سے زیادہ تر جزئیت رکھتا ہے، اور اسی طرح بعید بہ نسبت ابعد کے۔ پھر اگر وہ جزئیت قدرتی ہے، تو ہمدردی بھی قدرتی ہے۔ ہاں موانست اس کو نہایت تیز کر دیتی ہے، اور کبھی ایسی جو قدرتی سی معلوم ہوتی ہے، بلکہ اس لئے کہ اُن میں انسانیت کا ایک بڑا جزو جو علم یعنی دانستن ہے، نہیں ہے۔

قریبوں سے ہمدردی نہ کرنی نہایت بدخصلت قابل سزا کے ہے، اس لئے کہ قدرت کے نہایت مستحکم قاعدے کو توڑتا ہے اور کرنی کچھ بڑی صفت نہیں کیونکہ قدرت نے اس کے کرنے پر مجبور کر رکھا ہے۔ بعیدوں سے ویسی نہ کرنی کچھ سخت مذمت نہیں، اس لئے کہ قدرت کے کسی مستحکم قاعدہ کی برخلافی نہیں، اور کرنی نہایت عمدہ صفت ہے، کیونکہ قدرت کے منشاء کا بدرجہ اتم کامل کرتا ہے۔

افسوس ہے کہ عمدہ صفت کبھی دھوکا کھا کر معیوب بھی کر دی جاتی ہے، جبکہ پہلی کو ادنیٰ صفت سمجھ کر چھوڑتے ہیں، اور دوسری کو اعلیٰ صفت سمجھ کر پکڑتے ہیں۔ مگر پہلی کے چھوڑنے کی برائی، دوسری کی بھلائی کو بھی لے ڈوبتی ہے۔ پس سچی ہمدردی وہی ہے جو قدرت کے قانون کے مطابق اور قدرت کے منشاء کی تکمیل کے لئے ہو۔

۹۔ تعصّب

انسان کی بد ترین خصلتوں میں سے تعصّب بھی ایک بد ترین خصلت ہے کہ انسان کی تمام نیکیوں اور اس کی تمام خوبیوں کو غارت اور برباد کرتی ہے متعصب کو اپنی زبان سے نہ کہے مگر اس کا طریقہ یہ بات جتلاتا ہے کہ عدل و انصاف کی خصلت جو عمدہ ترین خصائل انسان سے ہے اس میں نہیں ہے متعصب اگر کسی غلطی میں پڑتا ہے تو اپنے تعصب کے سبب اس غلطی سے نکل نہیں سکتا کیونکہ اس کا تعصب اس کے برخلاف بات کے سننے اور سمجھنے اور اس پر غور کرنے کی اجازت نہیں دیتا اور اگر وہ کسی غلطی میں نہیں ہے بلکہ سچی اور سیدھی راہ پر ہے تو اس کے فائدے اور اس کی نیکی کو پھیلنے اور عام ہونے نہیں دیتا کیونکہ اس کے مخالفوں کو اپنی غلطی پر متنبہ ہونے کا موقع نہیں ملتا تعصب انسان کو ہر طرح کی نیکیوں کے حاصل کرنے سے باز رکھتا ہے اکثر دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ انسان کسی کام کو نہایت عمدہ اور مفید سمجھتا ہے مگر صرف تعصب سے اس کو اختیار نہیں کرتا اور دیدہ و دانستہ برائی میں گرفتار اور بھلائی سے بیزار رہتا ہے۔

مذہبی تعصبات کی نسبت بھی ہم کچھ تھوڑا سا بیان کریں گے مگر اوّل امور تمدن و معاشرت میں جو نقصان تعصب سے پیدا ہوتے ہیں ان کا ذکر کرتے ہیں۔

انسان قواعد قدرت کے مطابق مدنی الطبع پیدا ہوا ہے وہ تنہا اپنی حوائج ضروری کو مہیا نہیں کر سکتا اس کو ہمیشہ مددگاروں اور معاونوں

کی جو دوستی اور محبت سے ہاتھ آتے ہیں ضرورت ہوتی ہی مگر متعصب بسبب اپنے تعصب کے تمام لوگوں سے منحرف اور بیزار رہتا ہی اور کسی کی دوستی اور محبت کی طرف بجز ان چند لوگوں کے جو اس کے ہم رائے ہیں مائل نہیں ہوتا۔

عقل اور قواعد قدرت کا مقتضٰی یہ معلوم ہوتا ہی کہ امور متعلق تمدن و معاشرت میں جو باتیں زیادہ آرام اور زیادہ لیاقت اور زیادہ عزت کی ہیں ان کو انسان اختیار کرے مگر متعصب اُن سب نعمتوں سے محروم رہتا ہی ہنر اور فن اور علم ایسی عمدہ چیزیں ہیں کہ ان میں ہر ایک چیز کو نہایت اعلیٰ درجہ تک حاصل کرنا چاہیے مگر متعصب اپنی بدخصلت سے ہر ایک ہنر اور فن اور علم کے اعلیٰ درجہ تک پہنچنے سے محروم رہتا ہے۔

وہ ان تمام دلچسپ اور مفید باتوں سے جو نئی تحقیقات سے اور نئے علوم و فنون سے حاصل ہوتی ہیں محض جاہل اور ناواقف رہتا ہی اس کی عقل اور اس کے دماغ کی قوت محض بیکار ہو جاتی ہی اور جو کچھ اس میں سمائی ہوتی ہی اس کے سوا اور کسی بات کے سمجھنے کی اس میں طاقت اور قوت نہیں رہتی وہ ایک ایسے جانور کی مانند ہو جاتا ہی کہ اس کو جو کچھ بالطبع آتا ہی اس کے سوا اور کسی چیز کی تعلیم و تربیت کے قابل نہیں ہوتا۔

بہت سی قومیں ہیں جو اپنے تعصب کے باعث سے تمام باتوں میں کیا اخلاق میں اور کیا علم و ہنر میں اور کیا فضل و دانش میں اور کیا تہذیب و شائستگی میں اور کیا جاہ و حشمت اور مال و دولت میں اعلیٰ درجہ سے نہایت پست درجہ بذلت اور خواری کو پہنچ گئی ہیں اور بہت سی قومیں ہیں جنھوں نے اپنے بے تعصبی سے ہر جگہ اور ہر قوم سے اچھی اچھی باتیں اخذ

گئیں اور ادنی درجہ سے ترقی کر کے اعلیٰ سے اعلیٰ درجہ تک پہنچ گئیں مجھکو اپنے ملک کے بھائیوں پر اس بات کی بدگمانی ہی کہ وہ بھی تعصب کی بد خصلت میں گرفتار ہیں اور اس سبب سے ہزاروں قسم کی بھلائیوں کے حاصل کرنے سے اور دنیا میں اپنے تئیں ایک معزز قوم دکھانے سے محروم اور ذلت اور خواری اور بے علمی اور بے ہنری کی مصیبت میں گرفتار ہیں اور اسی لئے میری خواہش ہی کہ وہ اس بد خصلت سے نکلیں اور علم فضل اور ہنر و کمال کے اعلیٰ درجہ کی عزت تک پہنچیں ہم مسلمانوں میں ایک غلطی یہ پڑی ہی کہ بعض دفعہ ایک غلط نمائیکی کے جذبہ سے تعصب کو اچھا سمجھتے ہیں اور جو شخص اپنے مذہب میں بڑا متعصب ہو تمام شخصوں کو جو اس مذہب کے نہیں ہیں نہایت حقارت سے دیکھے اور بُرا سمجھیں اس شخص کو نہایت قابل تعریف اور توصیف کے پڑا پختہ اور پکا اپنے مذہب میں سمجھتے ہیں مگر ایسا سمجھنا سب سے بڑی غلطی ہی جس نے حقیقت میں مسلمانوں کو برباد کر دیا ہے ہمارا مذہب اور مذہبی علوم دنیا اور دنیاوی علوم بالکل علیحدہ چیزیں ہیں پس بڑی نادانی ہی جو دنیاوی علوم و فنون کے سیکھنے میں کسی قسم کے تعصب مذہبی کو کام میں لا دیں۔

اگر یہ خیال ہو کہ دنیاوی علوم کو سیکھنے سے ہمارے عقائد مذہبی میں سستی آتی ہے کیونکہ مذہبی مسائل اُن دنیاوی علوم کے پڑھنے سے مشتبہ یا غلط معلوم ہوتے ہیں تو نہایت ہی افسوس کا مقام ہے کہ مسلمان اپنے ایسے روشن اور مستحکم سچے مذہب کو ایسا کمزور اور ضعیف سمجھتے ہیں کہ دنیاوی علوم کی ترقی سے اس کی برہمی کا خیال کرتے ہیں ہمارا مذہب ہی

کہ جس قدر دینی اور دنیوی علوم کی ترقی ہوتی جاوے گی اُسی قدر اس کی سچائی زیادہ تر ثابت ہوگی اب ہم یہ بات بتاتے ہیں کہ اپنے مذہب میں پختہ ہونا جدا بات ہے اور یہ ایک نہایت عمدہ صفت ہے جو کسی اہل مذہب کے لئے ہو سکتی ہے اور تعصب گو کہ وہ مذہبی باتوں میں کیوں نہ ہو نہایت بُرا اور خود مذہب کو نقصان پہونچانے والا ہے۔

غیر متعصب مگر اپنے مذہب میں پختہ ہمیشہ سچا دانا دوست اپنے مذہب کا ہوتا ہے اس کی خوبیوں اور نیکیوں کو پھیلاتا ہے اس کے اصول کو دلائل و براہین سے ثابت کرتا ہے مخالفوں اور معترضوں اور بُرا کہنے والوں کی باتوں کو ٹھنڈے دل سے سنتا ہے اور خود بھی اس کے دفیعہ پر مستعد ہوتا ہے اور لوگوں کو بھی اس کے دفیعہ کا موقع دیتا ہے برخلاف اس کے متعصب نادان دوست اپنے مذہب کا ہوتا ہے وہ سراسر اپنی نادانی سے اپنے مذہب کو نقصان پہنچاتا ہے پہلی بسم اللہ ایسی بدخصلت اختیار کرنے سے جو ہر عقلمند کے نزدیک نفرت کے قابل ہے اپنے مذہب کے حسن اخلاق اور اس کے نتیجوں کی خوبی پر داغ لگاتا ہے اپنے مذہب کی خوبیوں کے پھیلنے اور لوگوں کو اس کی طرف راغب کرنے کے بدلے الٹا اس کا ہارج قومی ہوتا ہے اپنے تعصب کے سبب بد اخلاق مغرور اور متقشف اور سخت دل ہو جاتا ہے۔

مذہب میں متعصب شخص دوسروں کے اعتراضوں کو جو اس کے مذہب پر نہیں سُنتا یا مشہور ہونا پسند نہیں کرتا اور اس سبب سے ضمناً وہ اس

بات کا باعث ہوتا ہے کہ مخالفوں کے اعتراض بلا تحقیقات کئے اور بلا جواب
دئے باقی رہجاویں وہ اپنی نادانی سے تمام دنیا پر گویا یہ بات ظاہر کرتا ہے کہ
اس کے مذہب کو مخالفوں کے اعتراضوں سے نہایت اندیشہ اور اس کے
برہم ہو جانے کا خوف ہے بس یہ تمام باتیں مذہب کی درستی کی نہیں ہیں بلکہ
مخالفوں کی فتحیابی اور میدان جیت لینے کی ہیں۔

غرضکہ تعصب خواہ دینی باتوں میں ہو یا دنیاوی باتوں میں نہایت بُرا
اور بہت سی خرابیوں کا پیدا کرنے والا ہے۔

مغرور و متکبّر ہو جانا اور اپنے ہم جلسوں کو سوائے چند کے نہایت
حقیر و ذلیل سمجھنا متعصب کا خاصہ ہوتا ہے۔

اس کے اصول کا مقتضیٰ یہ ہوتا ہے کہ تمام دنیا کے لوگوں سے سوائے
چند کے کنارہ گزیں ہو مگر ایسا کر نہیں سکتا اور بہ مجبوری ہر ایک سے ملتا ہے
اوپری دل سے ان کا ادب اور اپنی جھوٹی نیازمندی بھی ظاہر کرتا ہے
اور ایسا کرنے سے ایک اور بد خصلت نفاق کذب اور دغا بازی فریب
و مکّاری کی اپنے میں پیدا کرتا ہے۔

دنیا میں کوئی قوم ایسی نہیں ہے جس نے خود ہی تمام کمالات اور تمام
خوبیاں اور خوشیاں حاصل کی ہوں بلکہ ہمیشہ ایک قوم نے دوسری قوم سے
فائدہ اُٹھایا ہے مگر متعصب شخص ان نعمتوں سے بدنصیب رہتا ہے علم میں اس کو
ترقی نہیں ہوتی ہنر و فن میں اس کو دستگاہ نہیں ہوتی دُنیا کے حالات سے وہ
ناواقف رہتا ہے عجائبات قدرت کے دیکھنے سے محروم رہتا ہے حصول معاش
[illegible] منقول مثل تجارت وغیرہ کے وسیلے جاتے رہتے ہیں اور

رفتہ رفتہ تمام دنیا کے انسانوں میں روز بروز ذلیل اور خوار اور حقیر و ناچیز ہو جاتا ہے۔

اس کی مثال ایک ایسے جانور کی ہوتی ہے جو اپنے ریوڑ میں ملا رہتا ہے اور نہیں جانتا کہ اس کے اور ہم جنس کیا کر رہے ہیں بلبل کیا چہچہاتی ہے اور قمری کیا غل مچاتی ہے بیا کیا بن رہا ہے اور مکھی کیا چن رہی ہے وہ بجز کوڑے کی گھاس چرنے کے اور کچھ نہیں جانتا کہ باغ کیوں بنا ہے اور پھول کیوں کھلا ہے نرگس کیا دیکھتی ہے اور انگور کی تاک کیا تاکتی ہے تعصب میں سب سے بڑا نقصان یہ ہے کہ جب تک وہ نہیں جاتا کوئی ہنر و کمال اس میں نہیں آتا تربیت و شائستگی تہذیب و انسانیت کا مطلق نشان نہیں پایا جاتا اور جب کہ وہ مذہبی غلط نما نیکی کے پردہ میں ظہور کرتا ہے تو اور بھی ستم قاتل ہو جاتا ہے کیونکہ مذہب سے اور تعصب سے کچھ تعلق نہیں ہے انسان کے خراب و برباد کرنے کے لئے شیطان کا سب سے بڑا داؤں تعصب کو مذہبی رنگت سے دل میں ڈالنا اور اس تاریکی کے فرشتے کو روشنی کا فرشتہ دکھاتا ہے۔

اسی لئے میری التجا اپنے بھائیوں سے یہ ہے کہ ہمارا خدا نہایت مہربان اور بڑا منصف ہے اور سچائی پسند کرنے والا ہے وہ ہمارے دلوں کے بھید جانتا ہے اور ہماری نیتوں کو پہچانتا ہے پس ہم کو اپنے مذہب میں نہایت سچائی سے پختہ رہنا مگر تعصب کو جو ایک بری خصلت ہے چھوڑنا چاہئے تمام بنی نوع انسان ہمارے بھائی ہیں ہم کو سب سے محبت اور سچا معاملہ رکھنا اور سب سے سچی دوستی اور سب کی سچی خیر خواہی کرنا ہمارا قدرتی فرض ہے پس اسی کی ہم کو پیروی چاہئے۔

۱۰۔ بحث و تکرار

جب کتے آپس میں مل کر بیٹھتے ہیں تو پہلے تیوری چڑھا کر ایک دوسرے کو بری نگاہ سے آنکھیں بدل بدل کر دیکھنا شروع کرتے ہیں۔ پھر تھوڑی تھوڑی گونجیلی آواز اُن کے نتھنوں سے نکلنے لگتی ہے۔ پھر تھوڑا سا جبڑا کھلتا ہے اور دانت دکھلائی دینے لگتے ہیں اور حلق سے آواز نکلنی شروع ہوتی ہے پھر باچھیں چر کر کانوں سے جا لگتی ہیں اور ناک سمٹ کر ماتھے پر چڑھ جاتی ہے۔ ڈاڑھوں تک دانت باہر نکل آتے ہیں۔ منہ سے جھاگ نکل پڑتے ہیں اور خفیف آواز کے ساتھ اٹھ کھڑے ہوتے ہیں اور ایک دوسرے سے چمٹ جاتے ہیں۔ اس کا ہاتھ اُس کے گلے میں اور اُس کی ٹانگ اس کی کمر میں۔ اُس کا کان اس کے منہ میں اور اس کا ٹینٹوا اُس کے جبڑے میں۔ اِس نے اُس کو کاٹا۔ اور اُس نے اس کو بھنبھوڑا۔ جو کمزور ہوا دُم دبا کر بھاگ نکلا۔ نا مہذب آدمیوں کی مجلس میں بھی آپس میں اسی طرح تکرار ہوتی ہے۔ پہلے صاحب سلامت کر کے آپس میں مل بیٹھتے ہیں۔ پھر دھیمی دھیمی بات چیت شروع ہوتی ہے۔ ایک کوئی بات کہتا ہے۔ دوسرا بولتا ہے واہ یوں نہیں یوں ہے۔ وہ کہتا ہے واہ تم کیا جانو۔ وہ بولتا ہے تم کیا جانو۔ دونوں کی نگاہ بدل جاتی ہے۔ تیوری

چڑھ جاتی ہے۔ رُخ بدل جاتا ہے۔ آنکھیں ڈراؤنی ہو جاتی ہیں۔ باچھیں
چر جاتی ہیں۔ دانت نکل پڑتے ہیں۔ تھوک اُڑنے لگتا ہے۔ باچھوں تک
کف بھر آتے ہیں۔ سانس جلدی چلتی ہے۔ رگیں تن جاتی ہیں۔ آنکھ
ناک۔ بھوں۔ ہاتھ عجیب عجیب حرکتیں کرنے لگتے ہیں۔ آستین چڑھا
ہاتھ پھیلا۔ اُس کی گردن اُس کے ہاتھ میں اور اُس کی داڑھی اُسکی
مٹھی میں لپاڈکی ہونے لگتی ہے کسی نے بیچ بچاؤ کر کے چھڑا دیا تو
غراتے ہوئے ایک اِدھر چلا گیا۔ اور ایک اُدھر۔ اور اگر کوئی بیچ بچاؤ
کرنے والا نہ ہوا تو کمزور نے پٹ کر کپڑے جھاڑتے سر سہلاتے اپنی
راہ لی۔

جس قدر تہذیب میں ترقی ہوتی ہے۔ اسی قدر اس تکرار میں کمی
ہوتی ہے۔ کہیں غرفش ہو کر رہ جاتی ہے۔ کہیں تو تو تکار تک نوبت
آجاتی ہے۔ کہیں آنکھیں بدلنے اور ناک چڑھانے اور جلدی جلدی سانس
چلنے ہی پر خیر گذر جاتی ہے مگر ان سب میں کسی نہ کسی قدر کتّوں کی
مجلس کا اثر پایا جاتا ہے۔ پس انسان کو لازم ہے کہ اپنے دوستوں
سے کتوں کی طرح بحث کرنے سے پرہیز کرے۔

انسانوں میں اختلاف رائے ضرور ہوتا ہے اور اُس کے پرکھنے
کے لئے بحث و مباحثہ ہی کسوٹی ہے اور اگر سچ پوچھو تو بے مباحثہ
اور دل لگی کے آپس میں دوستوں کی مجلس بھی پھیکی ہے۔ مگر ہمیشہ
مباحثہ میں تہذیب۔ شائستگی محبت اور دوستی کو ہاتھ سے

نہ دینا چاہیے۔

پس اے میرے عزیز ہموطنو۔ جب تم کسی کے برخلاف کوئی بات کہنی چاہو یا کسی کی بات کی تردید کا ارادہ کرو تو خوش اخلاقی اور تہذیب کو ہاتھ سے مت دو۔ اگر ایک ہی مجلس میں دو بدو بات چیت کرتے ہو تو اور بھی زیادہ نرمی اختیار کرو۔ چہرہ۔ لہجہ۔ آواز۔ وضع لفظ اس طرح رکھو جس سے تہذیب اور شرافت ظاہر ہو۔ مگر بناوٹ بھی نہ پائی جائے۔ تردیدی گفتگو کے ساتھ ہمیشہ سادگی سے معذرت کے لفظ استعمال کرو۔ مثلاً یہ کہ میری سمجھ میں نہیں آیا۔ یا شاید مجھے دھوکا ہوا۔ یا میں غلط سمجھا۔ گو بات تو عجیب ہے مگر آپ کے فرمانے سے باور کرتا ہوں۔ جب دو تین دفعہ بات کا الٹ پھیر ہو اور کوئی اپنی رائے کو نہ بدلے تو زیادہ تکرار نہ بڑھاؤ۔ یہ کہہ کر کہ میں اس بات کو پھر سوچوں گا یا اس پر پھر خیال کروں گا۔ جھگڑے کو کچھ ہنسی خوشی دوستی کی باتیں کہہ کر ختم کرو۔ دوستی کی باتوں میں اپنے دوست کو یقین دلاؤ کہ اس دو تین دفعہ کی الٹ پھیر سے تمہارے دل میں کچھ کدورت نہیں آئی ہے اور نہ تمہارا مطلب باتوں کی الٹ پھیر سے اپنے دوست کو کچھ تکلیف دینے کا تھا۔ کیونکہ جھگڑا یا شبہ زیادہ دنوں تک رہنے سے دونوں کی محبت میں کمی ہو جاتی ہے۔ اور رفتہ رفتہ دوستی ٹوٹ جاتی ہے اور ایسی عزیز چیز (جیسی کہ دوستی) ہاتھ سے جاتی رہتی ہے۔

جب کہ تم مجلس میں ہو جہاں مختلف رائے کے آدمی ملے ہوئے ہیں تو جہاں تک ممکن ہو جھگڑے اور تکرار اور مباحثے کو آنے مت دو۔ کیونکہ جب تقریر بڑھ جاتی ہے تو دونوں کو ناراض کر دیتی ہے جب دیکھو کہ تقریر لمبی ہوتی جاتی ہے۔ اور تیزی اور زور سے تقریر ہونے لگی ہے تو جس قدر جلد ممکن ہو اُس کو ختم کرو۔ اور آپس میں ہنسی خوشی مذاق کی باتوں سے دل ٹھنڈا کر لو۔ میں چاہتا ہوں کہ ممبر وطن اس بات پر غور کریں کہ اُن کی مجلسوں میں آپس کے مباحثے و تکرار کا انجام کیا ہوتا ہے۔ فقط

۱۱- عورتوں کے حقوق

تربیت یافتہ ملک اس بات پر بہت غل مچاتے ہیں کہ عورت اور مرد دونوں باعتبار آفرینش کے مساوی ہیں' اور دونوں برابر حق رکھتے ہیں' کوئی وجہ نہیں کہ عورتوں کو مردوں سے کم اور حقیر سمجھا جاوے' اگر تمثیلاً کہا جاوے کہ عورت انسان کے لئے بمنزلہ بائیں ہاتھ کے ہے' اور مرد بمنزلہ دائیں ہاتھ کے' یا قدر و قیمت میں عورت بمنزلہ سولہ آنے کے ہے' اور مرد' بمنزلہ روپیہ کے' تو بھی اس پر راضی نہیں ہوتے۔

بایں ہمہ ہم دیکھتے ہیں کہ جس قدر قدر و منزلت عورتوں کی مذہب

اسلام میں کی گئی ہے، اور ان کے حقوق اور ان کے اختیارات کو مردوں کے برابر کیا گیا ہے، اُس قدر آج تک کسی تربیت یافتہ ملک میں نہیں ہے۔ مسلمانی قانون میں عورتوں کو مردوں کے برابر حقوق اور اختیار تسلیم کئے گئے ہیں۔

حالتِ نابالغی میں جس طرح مرد، اُسی طرح عورت، بے اختیار اور ناقابل معاہدہ متصور ہے، اِلا بعد بلوغ، وہ بالکل مثل مرد کے مختار ہے اور ہر ایک معاہدہ کے لائق ہے۔

جس طرح مرد، اسی طرح عورت، اپنی شادی کرنے میں مختار ہیں، جس طرح کہ مرد کی بے رضامندی نکاح نہیں ہو سکتا، اسی طرح عورت کی بلا رضامندی نکاح نہیں ہو سکتا۔

وہ اپنی تمام ذاتی جائداد کی خود مالک اور مختار ہے، اور ہر طرح اس میں تصرّف کرنے کا اس کو اختیار کامل حاصل ہے۔

وہ مثل مرد کے ہر قسم کے معاہدے کی صلاحیت رکھتی ہے، اور اس کی ذات اور اس کی جائداد، اُن معاہدوں اور دستاویزوں کی بابت جوابدہ ہے، جو اس نے تحریر کی ہوں۔

جو جائداد قبل شادی اور بعد شادی اس کی ملکیت بن آئی ہو، وہ خود اس کی مالک ہے اور خود اس کے محاصل کی لینے والی ہے۔ وہ مثل مرد کے دعویٰ بھی کر سکتی ہے، اور اس پر بھی دعویٰ ہو سکتا ہے۔

وہ اپنے مال سے ہر ایک چیز خرید سکتی ہے، اور جو چاہے اس کو بیع کر سکتی ہے۔ وہ مثل مرد کے ہر قسم کی جائداد کو ہبہ، اور وصیت اور وقف کر سکتی ہے۔

وہ رشتہ داروں اور شوہر کی جائداد میں سے بہ ترتیب وراثت ورثہ پا سکتی ہے۔

وہ تمام مذہبی نیکیوں کو جو مرد حاصل کر سکتا ہے، حاصل کر سکتی ہے۔

وہ تمام گناہوں اور ثواب کے عوض میں دنیا اور آخرت میں، وہی سزا و جزا پا سکتی ہے جو مرد پا سکتا ہے۔

پس حقیقت میں مذہب اسلام میں جس طرح کہ عورت و مرد کو برابر سمجھا ہے، ویسا نہ کسی مذہب میں ہے، اور نہ کسی قوم کے قانون میں ہے، مگر تعجب اور کمال تعجب اس بات پر ہے کہ تمام تربیت یافتہ ملک، مسلمانوں کی عورتوں کی جو حالت ہے اس پر بہت کچھ نام رکھتے ہیں، اور اس میں کچھ شک نہیں کہ تربیت یافتہ ممالک کی عورتوں کی حالت، مسلمانوں اور مسلمان ممالک کی عورتوں کی حالت سے بدرجہا بہتر ہے حالانکہ معاملہ بالعکس ہونا چاہئے تھا۔

عورتوں کی حالت کی بہتری جو تربیت یافتہ ملکوں میں ہم نے تسلیم کی ہے، اس میں کچھ بھی خیال ہم نے بے پردگی کی آزادی کا نہیں کیا ہے کیونکہ ہماری رائے میں ہندوستان میں اس باب میں جسقدر تفریط ہے، اسیقدر تربیت یافتہ ملکوں میں افراط ہے اور وجہ کہ

شرع نے مقرر کی ہے، اور جہاں تک انسان اس پر غور کر سکتا ہے اور اپنی عقل کو کام میں لا سکتا ہے، بلاشبہ وہی حد نہایت درست اور ٹھیک معلوم ہوتی ہے۔

اس مقام پر جو ہم کو بحث ہے، وہ صرف مردوں کے عورتوں کے ساتھ حسنِ سلوک۔ اور حُسن معاشرت، اور تواضع، اور خاطر داری اور محبّت، اور پاسِ خاطر، اور ان کی آسائش، اور آرام، اور خوشی اور فرحت کی طرف متوجہ ہونا، اور ان کو ہر طرح پر خوش رکھنا اور بعوض اس کے کہ عورتوں کو اپنا خدمت گذار تصور کریں، ان کو اپنا انیس اور جلیس، اور رنج وراحت کا شریک اور اپنے کو ان کی اور اُن کو اپنی باعثِ مسرّت اور تقویت کے سمجھنے پر بحث ہے۔ بلاشبہ جہاں تک کہ ہم کو معلوم ہے، تربیت یافتہ ملکوں میں عورتوں کے ساتھ یہ تمام مراتب بخوبی برتے جاتے ہیں، اور مسلمان ملکوں میں ویسے نہیں برتے جاتے، اور ہندوستان میں تو ایسی نالائقی اور خاک اڑتی ہے کہ نعوذ باللہ منہا!

ہندوستان میں جس قدر کہ عورتوں کی حالت میں تنزل ہے صرف اس کا باعث احکام مذہب اسلام کی بخوبی پابندی نہ کرنا ہے، اگر ان کی پابندی کی جاوے تو بلاشبہ یہ تمام خرابیاں دور ہو جاویں معہذا بڑا باعث اس کا اَن سولائزڈ یعنی نا مہذب ہونا، مسلمانوں کا ہے۔

مہذب قوموں نے، باوجودیکہ ان کے ہاں کا قانون نسبت عورتوں کے نہایت ہی ناقص اور خراب تھا، اپنی عورتوں کی حالت کو نہایت اعلیٰ درجہ کی ترقی پر پہونچایا ہے، اور مسلمانوں نے باوجودیکہ اُن کا مذہبی قانون نسبت عورتوں کے، اور ان کی حالت بہتری کے تمام دنیا کے قوانین سے بہتر اور عمدہ تھا، مگر انہوں نے اپنے نامہذب ہونے سے ایسا خراب برتاؤ عورتوں کے ساتھ اختیار کیا ہے، جس کے سبب تمام قومیں ان کی حالت پر ہنستی ہیں، اور ہماری ذاتی برائیوں کے سبب، اس وجہ سے کہ قوم کی قوم ایک حالت پر ہے، اِلّا ماشاء اللہ اس قوم کے مذہب پر عیب لگاتی ہیں۔

پس اب یہ زمانہ نہیں ہے کہ ہم ان باتوں کی غیرت نہ کریں اور اپنے چال چلن کو درست نہ کریں، اور جیسا کہ مذہب اسلام روشن ہے، خود اپنے چال چلن سے اس کی روشنی کا ثبوت لوگوں کو نہ دکھاویں۔

۱۲۔ تربیت اطفال

اگر ہم اس بات پر خیال کریں کہ انسانوں کے عیوب، مثل کالے بادلوں کے جمع ہو کر ہم ہی پر برستے ہیں، تو دنیا سے انسانوں کے عیوب بہت کم ہو جاویں، اور اگر ہم مرے ہوئے لوگوں کی آواز پر کان دھریں، اور سمجھیں کہ وہ قبروں میں پڑے ہوئے زبان حال

سے کیا کہہ رہے ہیں، تو شاید ایک بھی بُرائی دنیا میں نہ رہے۔

افسوس! کہ ہماری آنکھیں اندھی اور ہمارے کان بہرے ہیں!

اکثر دیکھا جاتا ہے کہ جب وقت گزر جاتا ہے، تو بہت سی باتوں کا پچھتاوا آتا ہے کہ افسوس! ہم نے یہ نہ کیا اور وہ نہ کیا، اور اس وقت پچھتانے سے کیا ہوتا ہے، کیونکہ گیا وقت پھر ہاتھ نہیں آتا، اور لاعلاج رنج کا نہایت ہی جانکاہ رنج ہوتا ہے، پس اگر ہم ایسے سخت رنج سے بچنا چاہیں تو اس کا علاج صرف یہی ہے کہ موجودہ وقت کو غنیمت جانیں ؎

غنیمت دال ہمیں دم را کہ حالست!

یہ بات جو ہم نے کہی ٹھیک ٹھیک انسانوں کی طفولیت کی حالت سے نہایت ہی مناسبت رکھتی ہے، اس لئے کہ جو عمر اور وقت تربیت کا ہے، جب وہ گزر جاتا ہے تو بجز لاعلاج رنج رہ جانے کے اور کچھ نہیں ہوتا، اور پھر ان کا ناتربیت یافتہ رہنا مثل کالی گھٹا کے ہم پر کڑکتا ہے، اور ہم پر برستا ہے اور کسی کے گھر کو بہا دیتا ہے اور کسی کے خانماں کو جلا دیتا ہے۔

ہم دیکھتے ہیں کہ دنیا کی تمام چیزوں میں قدرتی تبادلہ ہوتا رہتا ہے، اور بجز انسان کے ایسی اور کوئی چیز نہیں ہے، جس کو ایس تبادلہ میں کچھ دخل ہو۔ اگرچہ انسان کو کسی چیز کے پیدا کرنے کی طاقت نہیں ہے، مگر اس میں اتنی قدرت ہے کہ بہت سی چیزوں کو اپنے

اختیار اور قابو ہیں کہ کر اس قدرتی تبادلہ میں شریک ہو، انسان ہی ایسا وجود ہے جو تھوڑا بہت کارخانہ قدرت کے بگاڑنے یا سنوارنے میں دخل رکھتا ہے۔ وہی ایسا ذی عقل اور ذی شعور مخلوق ہے کہ دنیا کی آیندہ کی رفتار کو روک سکتا ہے، یا ترقی کر سکتا ہے، یا ابتر وخراب حالت میں ڈال سکتا ہے۔

یہ اقتدار اس ناکامل اور فانی وجود کا جیسا کہ لڑکوں کے تربیت یافتہ یا نا تربیت یافتہ رکھنے سے ظاہر ہوتا ہے، ایسا اور کسی چیز سے ظاہر نہیں ہوتا۔ جبکہ ہم لڑکوں کی حالت پر غور کرتے ہیں، اور ان کی بھولی بھالی اور سیدھی سادی طبیعتوں کو ہر ایک قسم کے گناہ سے پاک ہوتے ہیں اور ہر قسم کی تربیت کی استعداد اُن میں دیکھتے ہیں تو ہم کو خدا کی کامل قدرت کا نمونہ دکھائی دیتا ہے اور یقین ہوتا ہے کہ وہ اس ذات کامل کی دلی بخشش کی ہوئی چیزیں ہیں۔ اس کے بعد ایک زمانہ تک وہ ہمارے ساتھ رہتی ہیں۔ ہمارے سامنے ان کی عقل وفہم کی ترقی ہوتی ہے اور ہماری تعلیم وتربیت ان میں اثر کرتی ہے اور یا تو اچھی اچھی مثالوں کے دیکھنے سے شروع ہی سے اُن میں عمدہ عمدہ عادتیں اور خصلتیں بیٹھ جاتی ہیں، اور یا بُری بُری نظیروں کے دیکھنے سے شروع ہی سے ان میں بد عادتیں اور خراب خصلتیں پڑ جاتی ہیں۔ بہرحال لڑکپن کا موسم نکل جاتا ہے، اور جو کچھ کہ لڑکوں نے ہماری صحبت اور تربیت سے نیک

یا بد حاصل کیا ہو اس کا اثر دنیا میں رہ جاتا ہے۔

لڑکپن کے زمانہ میں جو عمر کے سات برس سے پندرہ برس تک ہے، وہی ایسا زمانہ زندگی کا ہے جس میں آیندہ کی بہبودی کے لئے زیادہ تر کوشش ہو سکتی ہے۔ اس زمانہ میں لڑکوں کا دل ہر چیز کا متلاشی رہتا ہے، حافظہ تیز ہوتا ہے، قوتِ غور مضبوط ہوتی ہے، اچھی عادتوں کا دیکھنا اور عمدہ عمدہ نظیروں سے تربیت پانا جس کو عموماً نیک صحبت کہتے ہیں، نہایت ہی موثر ہوتا ہے۔ یہ زمانہ لڑکوں کے لئے ذہنی و عقلی اور اخلاقی تخم ریزی کا ہوتا ہے، کیونکہ اس وقت تعلیم کو دل نہایت جلد قبول کرتا ہے اور اس کے تخم کو جس میں آیندہ نہایت عمدہ عمدہ پھل پھول پیدا ہونگے، بہت جلد اُگا دیتا ہے۔ لیکن اگر اس زمانہ میں تربیت نہیں ہوتی تو پھر بہت ہی کم فائدہ ہوتا ہے، کیوں کہ جوں جوں دن گذرتے جاتے ہیں، عادت میں مضبوطی آتی جاتی ہے، یہاں تک کہ آخر کار عادت طبیعت سے مل جاتی ہے اور طبیعت ثانی کہلاتی ہے، جس کا بدلنا نہایت ہی دشوار ہے۔

ایک نہایت لائق شخص کا حکیمانہ قول ہے کہ:

"لڑکپن کی طبیعت کتنے بڑے امر اہم کی چیز ہے کہ آیندہ کی بھلائی یا برائی وغیرہ اسی کی احتیاط پر منحصر ہے جو لڑکوں کے مربیوں کی طرف سے ہوتی ہے!"

پس جو لوگ کہ قومی تربیت یا قومی ترقی کے خواہاں ہیں ان کا سب سے بڑا کام یہی ہے کہ لڑکوں کی تربیت کے لئے عمدہ انتظام کریں جن سے ہم کو آیندہ کی بہبودی کی توقع ہے، ورنہ ہم پر یہی مثل صادق آتی ہے کہ "میاں! کہیں بوڑھے طوطے بھی پڑھتے ہیں"۔

ہم دیکھتے ہیں کہ مسلمانوں میں تربیت اطفال کا کوئی ذریعہ موجود نہیں ہے، اور بڑا سبب اُن کی حالت کے تباہ ہونے اور اولاد کے نالائق رہنے یا آوارہ ہو جانے کا یہی ہے ہم ان حالتوں کا ذکر نہیں کرتے، جن میں اطفال آوارہ اور خراب ہو جاتے ہیں کیونکہ اس کو تو سب بُرا جانتے ہیں، بلکہ ہم تو اس حالت کا ذکر کرتے ہیں جس میں غلطی سے لوگ سمجھتے ہیں کہ ہماری اولاد نے خوب تربیت پائی ہے۔ غلطی اس لئے ہے کہ حقیقت میں وہ تربیت عمدہ تربیت نہیں ہے اور یہی سبب ہے کہ ان کو کچھ لیاقت نہیں آتی۔ اور ان کے دل میں اخلاقی فیاضی اور طبیعت کی آزادگی اور دل کی کشادگی پیدا نہیں ہوتی۔ تمام قوی جو ان میں خدا تعالیٰ نے رکھے ہیں، سب پژمردہ اور ناکارہ رہ جاتے ہیں، اور رفتہ رفتہ اُن میں وہ قوی جن سے انسان اپنے کسی زمانہ عمر میں نام آور اور دل چلا، اور عالی حوصلہ، غیرت والا ہوتا ہے، باقی نہیں رہتے۔

مسلمانوں میں اگر کسی شخص کی اولاد عوام الناس کے لونڈوں میں کھیل کود سے بچے، اور اپنے ہی ہم جولیوں میں رہے اور اپنے

یا اپنے ہمسر خاندان کی صحبت اٹھائے اور دوزانو بیٹھنا اور جھک کر سلام کرنا، یا عین کو ٹھیک مخرج سے نکال کر سلام علیک کرنا اور ہاتھ جوڑ کر مزاج شریف پوچھنا سیکھ جاوے تو نہایت سعادت مند اور تربیت یافتہ گنا جاتا ہے، اور جب اس کے ساتھ اس کو کچھ لکھنا پڑھنا بھی آتا ہو اور کسی میاں جی یا ملّا سے پڑھتا بھی ہو تو وہ تربیت کے کنگورہ پر پہونچا ہوا سمجھا جاتا ہے اور اگر بخت و اتفاق سے اس نے دو چار کتابیں زیادہ پڑھ لیں اور "صدرہ شمس بازغہ" پڑھنے لگے تو پھر تو باوا جان پھولے بھی نہیں سماتے اور لڑکے کا "میاں مولوی" اور "میاں فاضل محمد" کے سوا اور کوئی نام ہی نہیں لیتے۔

مگر صرف اتنا ہی جتنا کہ بیان ہوا کافی نہیں ہے بلکہ مفید تربیت ہونے کے لئے اور بہت کچھ ہونا چاہیئے۔ پس اگر غور سے دیکھا جاوے اور انصاف کیا جاوے تو یہ تربیت کچھ تربیت نہیں ہے۔ ایسی تربیت کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ لڑکوں کے خیالات مثل جانوروں کے خیالات محدود ہو جاتے ہیں، اور کسی قسم کی ترقی کا مادہ اُن میں نہیں رہتا۔ اُن کی حرکات نامودبانہ صرف ایسے بندر کی سی حرکات ہوتی ہیں، جس کو سلام کہنا اور ادب سے بیٹھنا اور کھڑے رہنا سکھایا ہو ان حرکات میں اُن اخلاقی اوصاف کا جن سے از خود حرکات انسانی بلاتصنع قدرتی ادب و اخلاق کے مقتضی پیدا ہوتی ہیں کچھ بھی اثر نہیں پایا جاتا، بلکہ انسان میں جو ایک مہذب دلیری و مودب

بہادری اور حملہ وحِ خودداری ہونی چاہیے جس کو مختصر لفظ "غیرت" سے تعبیر کیا جاتا ہے، ایسے ادب سکھانے سے باقی نہیں رہتی۔ اس کی طبیعت بعوض اس کے کہ بلند ہونے پر مائل ہو، پست ہونے پر رجوع کرتی ہے، جس کا بد اثر اس کی آئندہ عمر میں ظاہر ہوتا ہے۔ پڑھنا لکھنا آجانے سے اور منطقی یا فلسفی ہو جانے سے کامل تربیت خیال نہ کر لینی چاہیے، قطع نظر اس کے کہ علوم غیر مفیدہ کچھ بھی مفید نہیں ہو سکتے۔

صرف پڑھ لکھ لینے سے تربیت کامل نہیں ہو جاتی، بہت سے پڑھے لکھے ایسے موجود ہیں، جو بلحاظ تربیت کے، محض ایک کندۂ ناتراشی ہونے سے کچھ زیادہ رتبہ نہیں رکھتے۔ پس تربیت کامل کے لئے جیسا کہ علوم مفیدہ کا پڑھنا شرط ہے، ویسا ہی اس کے ساتھ لڑکے کی زندگی کا ایسے طور پر اور ایسی حالت پر بسر ہونا ضرور ہے جس سے روز بروز اس کے خیالات کو وسعت ہوتی جاوے اس کی امنگ بڑھتی جاوے اُس کے قویٰ شگفتہ و شاداب رہیں۔ غیرت جو ایک بڑا جوہر انسان کا ہے اور برائیوں سے بچانے کے لئے نہایت عمدہ اور سچا محافظ ہے، ہمیشہ ترقی پر رہے۔ ظاہری اخلاقی، اور مؤدبانہ حرکات اوپر اوپر مثل روغن قاز کے نہ لگائے جاویں، بلکہ مثل چشمۂ شیریں کے خود اندر سے نکلیں۔

نماز و روزہ اور کتب مذہبی کا پڑھنا، فی نفسہٖ نہایت عمدہ چیز ہے،

مگر جب اس کی تعلیم ایسے بد طریقے سے ہوتی ہے، جیسے کہ اب مسلمانوں میں مروج ہے، اس سے بجز اس کے کہ بد تعصبات بڑھ جاویں، اور بعوض نیکی اور نیک دلی کے، صفات ذمیمہ ترقی پکڑیں، اور مثل کانٹے دار سخت پوست کے دل کو گھیر لیں جس میں نیکی اور رحم اور رقت اور ہمدردی سچائی اور راست بازی مطلق اثر کرنے نہ پائے اور کچھ نتیجہ نہیں ہوتا۔ ایسا تربیت یافتہ شخص بجائے اس کے کہ فخر اسلام ہوتا، ننگ اسلام ہوتا ہے۔ اس لئے مسلمانوں کو جہاں اپنی اولاد کی تعلیم کی فکر ہونی چاہیے، اسی کے ساتھ اس بات کی بھی بہت بڑی فکر لازم ہے کہ زمانہ تربیت اور تحصیل علم میں لڑکوں کی زندگی بسر کرنے کی کیا تدبیر کرنی چاہیے، جس سے مقاصد مذکورہ بخوب ترین وجوہ حاصل ہوں۔

راست باز، متدین، پرہیزگار، عالی ہمت، مستقل مزاج، اور رنج و مصیبت میں ثابت قدم ہونے کے لئے یہ بات ضرور ہے کہ لڑکوں کا دل اور ان کی طبیعت ان صفات پر بخوبی حاوی ہو جاوے ورنہ تمام پند و نصائح اور نماز و روزہ نقش بر آب ہوتا ہے اور نہایت جلد سب میں فتور آ جاتا ہے اور تمام زندگی کی امیدیں اور بہبودیاں جاتی رہتی ہیں اور اس کا سبب صرف یہی ہے کہ ان سے کہا گیا پر ان کو سمجھنے نہیں دیا گیا کہ فلانی چیز درحقیقت عمدہ ہے، اور ہر چیز کی قدر صرف اس کی عمدگی ہی پر منحصر ہے۔

اگرچہ لڑکوں کی تعلیم کا فرض مقدم اُن کے ماں باپ پر ہے۔ مگر جیسی تعلیم کہ مطلوب ہے وہ بغیر اس کے کہ تمام قوم آپس میں متفق ہو کر اس کو قائم نہ کرے ممکن نہیں ہے اور اس لئے وہ فرض تمام قوم سے متعلق ہوتا ہے، اور کچھ شک نہیں ہے کہ ایسے سامان تعلیم کے موجود نہ ہونے سے تمام قوم گنہگار اور شرمسار ہے، اور اس لئے میں امید کرتا ہوں کہ اب لوگ ہوشیار ہوں گے اور اس فرض کفایہ کے پورا کرنے پر، جو بسبب ضرورت و حاجت شدید کے رتبہ میں فرض عین سے زیادہ بڑھ گیا ہے، توجہ فرمائیں گے۔

۱۳- اپنی مدد آپ

یہ ایک نہایت عمدہ اور آزمودہ مقولہ ہے۔ اس چھوٹے سے فقرہ میں انسانوں کا اور قوموں کا اور نسلوں کا تجربہ جمع ہے۔

ایک شخص میں اپنی مدد آپ کرنے کا جوش اس کی ترقی کی سچی بنیاد ہے، اور جبکہ یہ جوش بہت سے شخصوں میں پایا جاتا ہے تو وہ قومی ترقی اور قومی طاقت اور قومی مضبوطی کی جڑ ہے۔ جب کسی شخص کے لئے یا کسی گروہ کے لئے کوئی دوسرا کچھ کرتا ہے تو اس شخص میں سے یا اس گروہ میں سے وہ جوش اپنی مدد آپ کرنے کا کم ہو جاتا ہے اور ضرورت اپنے آپ مدد کرنے کی اُن

کے دل سے مٹتی جاتی ہے' اور اسی کے ساتھ غیرت جو ایک نہایت
عمدہ قوت انسان میں ہے اور اسی کے ساتھ عزت جو اصلی چمک
دمک انسان کی ہے' از خود جاتی رہتی ہے' اور جبکہ ایک قوم
کی قوم کا یہ حال ہو تو وہ ساری قوم دوسری قوموں کی آنکھ میں
ذلیل اور بے غیرت اور بے عزت ہو جاتی ہے۔

آدمی جس قدر کہ دوسرے پر بھروسہ کرتے جاتے ہیں' خواہ
اپنی بھلائی اور اپنی ترقی کا بھروسہ گورنمنٹ ہی پر کیوں نہ کریں
یہ امر بدیہی اور لابدی ہے کہ وہ اسی قدر بے مدد اور بے عزت
ہوتے جاتے ہیں۔ اے میرے ہموطن بھائیو! کیا تمہارا یہی حال
نہیں ہے؟

ایشیا کی تمام قومیں یہی سمجھتی رہی ہیں کہ اچھا بادشاہ ہی رعایا
کی ترقی اور خوشی کا ذریعہ ہوتا ہے۔ یورپ کے لوگ جو ایشیا
کے لوگوں سے زیادہ ترقی کر گئے تھے' یہ سمجھتے تھے کہ عمدہ انتظام
قوم کی عزت و بھلائی و خوشی اور ترقی کا ذریعہ ہے' خواہ وہ انتظام
باہمی قوم کے رسم و رواج کا ہو یا گورنمنٹ کا' اور یہی سبب ہے
کہ یورپ کے لوگ قانون بنانے والی مجلسوں کو بہت بڑا ذریعہ
انسان کی ترقی و بہبودی کا خیال کر کے' ان کا درجہ سب سے اعلیٰ
اور نہایت بیش بہا سمجھتے تھے مگر حقیقت میں یہ سب خیال غلط ہیں
ایک شخص فرض کرو کہ پارلیمنٹ کا ممبر ہی کیوں نہ ہو جائے

قومی عزت اور قومی بھلائی اور قومی ترقی کیا کر سکتا ہے؟ برس دو برس میں کسی بات پر ووٹ دے دینے سے گو وہ کیسی ہی ایمانداری اور انصاف سے کیوں نہ دیا ہو، قوم کی کیا بھلائی ہو سکتی ہے، بلکہ خود اس کے چال چلن پر، اس کے برتاؤ پر بھی اس سے کوئی اثر پیدا نہیں ہوتا، تو قوم کے برتاؤ پر کیا اثر پیدا کر سکتا ہے۔ ہاں! یہ بات بے شبہ ہے کہ گورنمنٹ سے انسان کے برتاؤ میں کچھ مدد نہیں ملتی، مگر عمدہ گورنمنٹ سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ آدمی آزادی سے اپنے قوائے عمل کی تکمیل اور اپنی شخصی حالت کی ترقی کر سکتا ہے۔

یہ بات روز بروز روشن ہوتی جاتی ہے کہ گورنمنٹ کا فرض بہ نسبت مثبت اور معمل ہونے کے زیادہ تر منفی اور مانع ہے، اور وہ فرض جان اور مال اور آزادی کی حفاظت ہے جب کہ قانون کا عملدر آمد دانشمندی سے ہوتا ہے تو آدمی اپنی جسمی اور ذہنی محنت کے ثمروں کا بے خطرہ حظ اٹھا سکتا ہے۔ جس قدر گورنمنٹ کی حکومت عمدہ ہوتی ہے، اتنا ہی ذاتی نقصان کم ہوتا ہے، مگر کوئی قانون گو وہ کیسا ہی ابھارنے والا کیوں نہ ہو سست آدمی کو محنتی، فضول خرچ کو کفایت شعار، شراب خوار کو تائب نہیں بنا سکتا، بلکہ یہ باتیں محنت، کفایت شعاری، نفس کشی سے حاصل ہو سکتی ہیں، قومی ترقی، قومی عزت، قومی اصلاح، عمدہ عادتوں، عمدہ چال چلن، عمدہ برتاؤ کرنے سے ہوتی ہیں، نہ گورنمنٹ میں بڑے

بڑے حقوق اور اعلیٰ اعلیٰ درجے حاصل کرنے سے۔

نہایت ٹھیک بات ہے کہ گورنمنٹ عموماً اُن لوگوں کا جن پر وہ حکومت کرتی ہے عکس ہوتی ہے۔ جو رنگ ان کا ہوتا ہے، اسی کا عکس گورنمنٹ میں پایا جاتا ہے۔ جو گورنمنٹ اپنی رعایا سے تہذیب و شائستگی میں آگے بڑھی ہوئی ہے، رعایا اس کو زبردستی پیچھے کھینچ لاتی ہے، اور جو گورنمنٹ اپنی رعایا سے کمتر اور تہذیب و شائستگی میں پیچھے ہوتی ہے، وہ ترقی کی دوڑ میں رعایا کے ساتھ آگے کھنچ جاتی ہے۔

یہ ایک نیچر کا قاعدہ ہے کہ جیسا مجموعہ قوم کے چال چلن کا ہوتا ہے، یقینی اس کے موافق اس کے قانون اور اسی کے مناسب حال گورنمنٹ ہوتی ہے۔ جس طرح کہ پانی خود بخود اپنی سطح میں آجاتا ہے اسی طرح عمدہ رعایا پر عمدہ حکومت ہوتی ہے، اور جاہل و خراب و ناتربیت یافتہ رعایا پر ویسی ہی اکھڑ حکومت کرنی پڑتی ہے۔

تمام تجربوں سے ثابت ہوا ہے کہ کسی ملک کی خوبی و عمدگی اور قدر و منزلت، بہ نسبت وہاں کی گورنمنٹ کے عمدہ ہونے کے زیادہ تر اس ملک کی رعایا کے چال چلن، اخلاق و عادت، تہذیب و شائستگی پر منحصر ہے، کیونکہ قوم شخصی حالتوں کا مجموعہ ہے اور ایک قوم کی تہذیب درحقیقت ان مرد و عورت و بچوں کی شخصی ترقی پر ہے، جن سے وہ قوم بنی ہے۔

قومی ترقی مجموعہ ہے شخصی محنت، شخصی عزت، شخصی ایمانداری، شخصی ہمدردی کا، اسی طرح قومی تنزل مجموعہ ہے شخصی سستی، شخصی بے غیرتی، شخصی بے ایمانی، شخصی خودغرضی کا، اور شخصی برائیوں کا۔ ناتہذیبی بدچلنی، جو اخلاقی وتمدنی، یا باہمی معاشرت کی بدیوں میں شمار ہوتی ہے، درحقیقت وہ خود اسی شخص کی آوارہ زندگی کا نتیجہ ہے۔ اگر ہم چاہیں کہ بیرونی کوشش سے ان برائیوں کو جڑ سے اکھاڑ ڈالیں اور نیست ونابود کر دیں تو یہ برائیاں کسی اور نئی صورت میں اس سے بھی زیادہ زور شور سے پیدا ہو جاویں گی جب تک شخصی زندگی اور شخصی چال چلن کی حالتوں کو ترقی نہ دی جاوے۔

اے میرے عزیز ہموطنو! اگر یہ رائے صحیح ہے تو اس کا یہ نتیجہ ہے کہ قوم کی سچی ہمدردی اور سچی خیرخواہی کرو، غور کرو کہ تمہاری قوم کی شخصی زندگی اور شخصی چال چلن کس طرح پر عمدہ ہو تا کہ تم بھی ایک معزز قوم ہو۔ کیا جو طریقہ تعلیم وتربیت کا، بات چیت کا، وضع لباس کا، سیر سپاٹے کا، شغل واشغال کا تمہاری اولاد کے لئے ہے، اُس سے ان کی شخصی چال چلن، اخلاق وعادات، نیکی وسچائی میں ترقی ہو سکتی ہے؟ حاشا وکلاّ!

جبکہ ہر شخص اور کل قوم خود اپنی اندرونی حالتوں سے آپ اصلاح کر سکتی ہے تو اس بات کی اُمید پر بیٹھے رہنا کہ بیرونی زور ان کی یا قوم کی اصلاح کرے کس قدر افسوس بلکہ نادانی کی بات ہے:

وہ شخص درحقیقت غلام نہیں ہے جس کو ایک ناخدا ترس نے جو اس کا ظالم آقا کہلایا جاتا ہے، خرید لیا ہے، یا ایک ظالم اور خود مختار بادشاہ یا گورنمنٹ کی رعیت ہے بلکہ درحقیقت وہ شخص اصلی غلام ہے، جو بداخلاقی، خودغرضی، جہالت اور شرارت کا مطیع اور اپنی خودغرضی کی غلامی میں مبتلا اور قومی ہمدردی سے بے پروا ہے۔ وہ قومیں جو اس طرح دل میں غلام ہیں، وہ بیرونی زوردل سے یعنی عمدہ گورنمنٹ یا عمدہ قومی انتظام سے، آزاد نہیں ہو سکتیں جب تک کہ غلامی کی یہ دلی حالت دور نہ ہو۔

جب تک انسانوں میں یہ خیال ہے کہ ہماری اصلاح و ترقی گورنمنٹ پر یا قوم کے عمدہ انتظام پر منحصر ہے اس وقت تک کوئی مستقل اور برتاؤ میں آنے کے قابل نتیجہ اصلاح و ترقی کا قوم میں پیدا نہیں ہو سکتا۔ گو کیسی ہی عمدہ تبدیلیاں گورنمنٹ یا انتظام میں کی جاویں، وہ تبدیلیاں فانوس خیال سے کچھ زیادہ رتبہ نہیں رکھتیں، جس میں طرح طرح کی تصویریں پھرتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں مگر جب دیکھو تو کچھ بھی نہیں۔

مستقل اور مضبوط آزادی، سچی عزت، اصلی ترقی، شخصی چال چلن کے عمدہ ہونے پر منحصر ہے، اور وہی شخصی چال چلن، معاشرت و تمدن کا محافظ، اور وہی شخصی چال چلن، قومی ترقی کا بڑا ضامن ہے "جان اسٹیورٹ مل" جو اس زمانہ میں ایک بہت بڑا دانا حکیم

گذرا ہے، اس کا قول ہے کہ "ظالم اور خود مختار حکومت بھی زیادہ خراب نتیجے پیدا نہیں کر سکتی، اگر اس کی رعایا میں شخصی اصلاح، اور شخصی ترقی موجود ہے، اور جو چیز کہ شخصی اصلاح و شخصی ترقی کو دبا دیتی ہے، درحقیقت وہی شے اس کے لئے ظالم و خود مختار گورنمنٹ ہے، پھر اس شے کو چاہو جس نام سے پکارو"۔ اس مقولہ پر میں اس قدر اور زیادہ کہتا ہوں کہ جہاں شخصی اصلاح و شخصی ترقی مٹ گئی ہے یا دب گئی ہے، وہاں کیسی ہی آزاد اور عمدہ گورنمنٹ کیوں نہ قائم کی جاوے، وہ کچھ بھی عمدہ نتیجے پیدا نہیں کر سکتی۔

انسان کی قومی ترقی کی نسبت ہم لوگوں کے یہ خیال ہیں کہ کوئی خضر ملے، گورنمنٹ فیاض ہو اور ہمارے سب کام کر دے۔ اس کے یہ معنی ہیں کہ ہر چیز ہمارے لئے کی جاوے اور ہم خود کچھ نہ کریں۔ یہ ایسا مسئلہ ہے کہ اگر اس کو ہادی اور رہنما بنایا جاوے تو تمام قوم کی دلی آزادی کو برباد کر دے اور آدمیوں کو انسان پرست بنا دے۔ حقیقت میں ایسا ہونا قوت کی پرستش ہے، اور اس کے نتائج انسان کو ایسا ہی حقیر بنا دیتے ہیں جیسے کہ صرف دولت کی پرستش سے انسان حقیر و ذلیل ہو جاتا ہے۔ کیا لالہ اشرفی مل، جو ہر روز لچھمی کی پوجا کرتے ہیں اور بے انتہا دولت رکھتے ہیں، انسانوں میں کچھ قدر و منزلت کے لائق گنے جاتے ہیں؟ بڑا سچا مسئلہ اور نہایت مضبوط، جس سے دنیا کی معزز قوموں

نے عزت پائی ہے وہ اپنی مدد آپ کرتا ہے۔ جس وقت لوگ اس کو اچھی طرح سمجھیں گے اور کام میں لاویں گے تو پھر خضر کو ڈھونڈنا بھول جاویں گے۔ اوروں پر بھروسہ اور اپنی مدد آپ' یہ دونوں اصول ایک دوسرے کے بالکل مخالف ہیں: پچھلا انسان کی بدیوں کو برباد کرتا ہے' اور پہلا' خود انسان کو۔

قومی انتظام یا عمدہ قوانین کے اجرا کی خواہش! یہ بھی ایک قدیمی غلط خیال ہے۔ سچا اصول وہ ہے جو' ولیم ڈراگن' نے ڈبلن کی نمائش گاہ دستکاری میں کہا تھا کہ:

"جس وقت میں آزادی کا لفظ سنتا ہوں' اسی وقت مجھکو میرا ملک اور میرے شہر کے باشندے یاد آتے ہیں۔ ہم اپنی آزادی کے لئے بہت سی باتیں سنتے آئے ہیں مگر میرے دل میں بہت بڑا مضبوط یقین ہے کہ ہماری محنت' ہماری آزادی' ہمارے اوپر منحصر ہے۔ میں یقین کرتا ہوں کہ اگر ہم محنت کئے جاویں اور اپنی قوتوں کو ٹھیک طور پر استعمال کریں تو اس سے زیادہ ہم کو کوئی موقع یا آیندہ کی قوی توقع اپنی بہتری کے لئے نہیں ہے۔ استقلال اور محنت کامیابی کا بڑا ذریعہ ہے۔ اگر ہم ایک ولی ولولہ اور محنت سے کام کئے جائیں گے تو مجھے پورا یقین ہے کہ تھوڑے زمانہ میں ہماری حالت بھی ایک عمدہ قوم کی مانند آرام وخوشی و آزادی

کی ہو جاوے گی"۔

انسان کی اگلی پشتوں کے حالات پر خیال کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان کی موجودہ حالت انسانوں کے نسل در نسل کے کاموں سے حاصل ہوئی ہے۔ محنتی اور مستقل مزاج محنت کرنیوالوں زمین کے جوتنے والوں، کانوں کے کھودنے والوں، نئی نئی باتوں کے ایجاد کرنے والوں، مخفی باتوں کو ڈھونڈھ کر نکالنے والوں آلات جر ثقیل سے کام لینے والوں اور ہر قسم کے پیشے کرنے والوں، ہنر مندوں، شاعروں، حکیموں، فیلسوفوں، ملکی منتظموں نے انسان کو موجود ترقی کی حالت پر پہونچانے میں بڑی مدد دی ہے۔

ایک نسل نے دوسری نسل کی محنت پر عمارت بنائی ہے، اور اس کو ایک اعلیٰ درجہ تک پہونچایا ہے۔ ان عمدہ کاریگروں سے جو تہذیب و شائستگی کی عمارت کے معمار ہیں، لگاتار ایک دوسرے کے بعد ہونے سے محنت اور علم و ہنر میں جو ایک بے ترتیبی کی حالت میں تھے ایک ترتیب پیدا ہوئی ہے۔ رفتہ رفتہ نیچر کی گردش نے موجودہ نسل کو اس زرخیز اور بیش بہا جائداد کا وارث کیا ہے جو ہمارے بزرگوں کی ہوشیاری اور محنت سے مہیا ہوئی تھی، اور وہ جائداد ہم کو اس لئے نہیں دی گئی ہے کہ ہم صرف مثل مار سر گنج، اس کی حفاظت ہی کیا کریں، بلکہ ہم کو اس لئے دی گئی ہے کہ اس کو ترقی دیں اور ترقی یافتہ حالت میں، آیندہ نسلوں کے لئے چھوڑ

جائیں، مگر افسوس! صد ہزار افسوس!! کہ ہماری قوم نے اُن بُزرگوں کی چھوڑی ہوئی جائداد کو بھی گرا دیا۔

انگریزوں کو جو دنیا کے اس دور میں اس قدر ترقی ہوئی اس کا سبب صرف یہی ہے کہ ہمیشہ ان کی قوم میں اپنی مدد آپ کرنے کا جذبہ رہا ہے اور اس قوم کی شخصی محنت اس پر گواہ عادل ہے یہی مسئلہ اپنی مدد آپ کرنے کا انگریزوں کی طاقت کا سچا پیمانہ رہا ہے۔ ان میں اگرچہ بہت سے ایسے لوگ بھی تھے جو تمام لوگوں سے اعلیٰ درجہ کے اور زیادہ مشہور تھے، اور جن کی تمام لوگ عزت بھی کرتے تھے، لیکن کم درجے کے اور غیر مشہور آدمیوں کے گروہوں میں سے بھی اس قوم کی بڑی ترقی ہوئی ہے۔ گو کسی لڑائی اور میدانِ کارزار کی فہرستوں اور تاریخوں میں صرف بڑے بڑے جنرلوں اور سپہ سالاروں کے نام لکھے گئے ہوں، لیکن وہ فتوحات ان کو زیادہ تر اُنہی مختلف لوگوں کی شجاعت اور بہادری کے سبب ہوئی ہیں۔

عام لوگ ہی تمام زمانوں میں سب سے زیادہ کام کرنے والے ہوئے ہیں۔ بہت سے ایسے شخص ہیں جن کی زندگی کا حال کسی نے نہیں لکھا، لیکن تہذیب و شائستگی اور ترقی پر ان کا بھی ایسا ہی قوی اثر ہوا ہے جیسا کہ ان خوش نصیب مشہور نامور آدمیوں کا ہوا ہے جن کی زندگی کے حالات مورخوں نے اپنی تاریخوں میں لکھے ہیں۔

ایک نہایت عاجز و مسکین غریب آدمی جو اپنے ساتھیوں کو محنت اور پرہیزگاری اور بے لگاؤ ایمانداری کی نظیر دکھاتا ہے، اس شخص کا اس کے زمانہ میں اور آیندہ زمانہ میں اس کے ملک اس کی قوم کی بھلائی پر بہت بڑا اثر پیدا ہوتا ہے، کیونکہ اس کی زندگی کا طریقہ اور چال چلن گو معلوم نہیں ہوتا مگر اور شخصوں کی زندگی میں خفیہ خفیہ پھیل جاتا ہے، اور آیندہ نسل کے لئے ایک عمدہ نظیر بن جاتا ہے۔

ہر روز کے تجربہ سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ شخصی ہی چال چلن میں یہ قوت ہے کہ دوسرے کی زندگی اور برتاؤ اور چال چلن پر نہایت قوی اثر پیدا کرتا ہے اور حقیقت میں یہی ایک نہایت عمدہ عملی تعلیم ہے۔ جب ہم اس عملی تعلیم کا علمی تعلیم سے مقابلہ کریں، تو مکتب و مدرسے اور مدرستہ العلوم کی تعلیم اس عملی تعلیم کی ابتدائی تعلیم معلوم ہوتی ہے۔ زندگی کے علم کا یعنی زندگی کے برتاؤ کے علم کا جس کو انگریزی میں "لائف ایجوکیشن" کہتے ہیں انسان پر، قوم پر، بہت زیادہ اثر ہوتا ہے۔ مکتب و مدرسہ و مدرستہ العلوم کا علم طاق میں یا صندوق میں، یا الماری میں، یا کسی بڑے کتب خانہ میں رکھا ہوا ہوتا ہے مگر زندگی کے برتاؤ کا علم ہر وقت دوست سے ملتے میں گھر کے رہنے سہنے میں، شہر کی گلیوں میں پھرتے میں، صرافہ کی دوکان کرتے میں، ہل جوتتے میں، کپڑا بننے کے کارخانے میں، کلوں سے

کام کرنے کے کارخانے میں اپنے ساتھ ہوتا ہے' پھر بے سکھائے' اور بے استاد بنائے لوگوں میں صرف اس کے برتاؤ سے پھیلتا جاتا ہے۔

یہ پچھلا علم وہ علم ہے' جو انسان کو انسان بناتا ہے۔ اس پچھلے علم سے عمل، چال چلن، تعلیم نفسی' نفس کشی' شخصی خوبی' قومی مضبوطی' قومی عزت حاصل ہوتی ہے۔ یہی پچھلا علم وہ علم ہے کہ جو انسان کو اپنے فرائض ادا کرنے' اور دوسروں کے حقوق محفوظ رکھنے اور زندگی کے کاروبار کرنے اور اپنی عاقبت کے سنوارنے کے لائق بنا دیتا ہے۔ اس تعلیم کو آدمی صرف کتابوں سے نہیں سیکھ سکتا' اور نہ یہ تعلیم کسی درجہ کی علمی تحصیل سے حاصل ہوتی ہے۔

لارڈ بیکن کا نہایت عمدہ قول ہے کہ "علم سے عمل نہیں آجاتا' علم کو عمل میں لانا' علم سے باہر اور علم سے برتر ہے۔ اور مشاہدہ آدمی کی زندگی کو درست اور اس کے علم کو با عمل یعنی اس کے برتاؤ میں کر دیتا ہے۔" علم کی بہ نسبت عمل' اور کسوا لخصری کی بہ نسبت عمدہ چال چلن' آدمی کو زیادہ تر معزز اور قابل ادب بناتا ہے۔

۱۴- آزادیٔ رائے

رائے کی آزادی ایک ایسی چیز ہے کہ ہر ایک انسان اس پر پورا پورا حق رکھتا ہے۔ فرض کرو کہ تمام آدمی بجز ایک شخص کے کسی بات پر متفق الرّائے ہیں، مگر صرف وہی ایک شخص ان کے برخلاف رائے رکھتا ہے تو ان تمام آدمیوں کو اس ایک شخص کی رائے غلط ٹھہرانے کے لئے اس سے زیادہ کچھ استحقاق نہیں ہے جتنا کہ اس ایک شخص کو اُن تمام آدمیوں کی رائے کے غلط ثابت کرنے کا اگر وہ ثابت کر سکے، استحقاق حاصل ہے۔

کوئی وجہ اس بات کی نہیں ہے کہ پانچ آدمیوں کو بمقابلہ چار آدمیوں کی رایوں کے غلط ٹھہرانے کا استحقاق ہو اور ایک آدمی کو بمقابل نو آدمیوں کے استحقاق نہ ہو۔ رائے کی غلطی آدمیوں کی تعداد کی کمی بیشی پر منحصر نہیں ہے، بلکہ قوتِ استدلال پر منحصر ہے۔ جیسے کہ یہ بات ممکن ہے کہ نو آدمیوں کی رائے بمقابلہ ایک شخص کے صحیح ہو ویسے ہی یہ بھی ممکن ہے کہ ایک شخص کی رائے بمقابل نو کے صحیح ہو۔

رایوں کا بند رہنا خواہ بسبب کسی مذہبی خوف کے اور خواہ بسبب اندیشہ برادری و قوم کے اور خواہ بدنامی کے ڈر سے،

اور یا گورنمنٹ کے ظلم سے نہایت ہی بری چیز ہے۔ اگر رائے اس قسم کی کوئی چیز ہوتی کہ جس کی قدر و قیمت صرف اس رائے والے کی ذات ہی سے متعلق اور اسی میں محصور ہوتی تو رایوں کے بند رہنے سے ایک خاص شخص کا یا معدودے چند کا نقصان متصور ہوتا مگر رایوں کے بند رہنے سے تمام انسانوں کی حق تلفی ہوتی ہے اور کل انسانوں کو نقصان پہونچتا ہے اور نہ صرف موجودہ انسانوں کو بلکہ ان کو بھی جو آیندہ پیدا ہوں گے۔

اگرچہ رسم و رواج بھی ان کے برخلاف رایوں کے اظہار کے لئے ایک بہت قوی مزاحم کار گنے جاتے ہیں، لیکن مذہبی جبارات مخالف مذہب رائے کے اظہار اور مشتہر ہونے کے لئے نہایت اقوائے مزاحم کار ہوتے ہیں۔ اس قسم کے لوگ صرف اسی پر اکتفا نہیں کرتے کہ اس مخالف رائے کا ظاہر ہونا، ان کو ناپسند ہوا ہے بلکہ اسی کے ساتھ جوش مذہبی اُمنڈ آتا ہے اور عقل کو تسلیم نہیں رکھتا، اور اس حالت میں اُن سے ایسے افعال و اقوال سرزد ہوتے ہیں جو انہیں کے مذہب کو جس کے وہ طرفدار ہیں مضرت پہونچاتی ہیں وہ خود اس بات کے باعث ہوتے ہیں کہ مخالفوں کے اعتراض

لامعلوم رہیں، وہ خود اس بات کے باعث ہوتے ہیں کہ بسبب پوشیدہ رہنے ان اعتراضوں کے انہیں کے مذہب کے لوگ ان کے حل پر متوجہ نہ ہوں، اور مخالفوں کے اعتراض بلاتحقیق کئے اور

بلا دفع کئے باقی رہ جاویں، وہ خود اس بات کے باعث ہوتے ہیں کہ ان کی آئندہ نسلیں بسبب ناتحقیق رہ جانے ان اعتراض کے جس وقت ان اعتراضوں سے واقف ہوں، اسی وقت مذہب سے منحرف ہو جاویں، وہ خود اس بات کے باعث ہوتے ہیں کہ وہ اپنی نادانی سے تمام دنیا پر گویا یہ بات ظاہر کرتے ہیں کہ اس مذہب کو جس کے وہ پیرو ہیں مخالفوں کے اعتراضوں سے نہایت ہی اندیشہ ہے۔ اگر انہی کے مذہب کا کوئی شخص بغرض حصول اغراض مذکورہ ان کو پھیلانا چاہتا ہے تو اس کو معترض کی جگہ تصوّر کرتے ہیں اور اپنی نادانی سے دوست کو دشمن قرار دیتے ہیں۔

کیا عمدہ رائے ایک فیلسوف کی ہے کہ:

"کسی رائے کے حامیوں کا اس رائے کے برخلاف رائے کے مشتہر ہونے میں مزاحمت کرنے سے خود ان حامیوں کا بہ نسبت ان کے مخالفوں کے زیادہ نقصان ہے، اس لئے اگر وہ رائے صحیح و درست ہو تو اس کی مزاحمت سے غلطی کے بدلے صحیح بات حاصل کرنے کا موقع اُن کے ہاتھ سے جاتا ہے اور اگر وہ غلط ہے تو اس بات کا موقع باقی نہیں رہتا کہ غلطی اور صحت کے مقابلہ سے جو صحت کو زیادہ استحکام اور اس کی سچائی زیادہ تر دلوں پر مؤثر ہوتی ہے اور اس کی روشنی دلوں میں بیٹھ

جاتی ہے، اس کا نتیجہ کو حاصل کریں جو فی الحقیقت نہایت
عمدہ فائدہ ہے۔"
کچھ شبہ نہیں ہے کہ عموماً مخالف اور موافق رایوں کا پھیلنا اور منتشر ہونا خواہ وہ دینی معاملہ سے علاقہ رکھتی ہوں یا دنیوی معاملہ سے نہایت ہی عمدہ اور مفید ہے۔ دونوں قسم کی رایوں پر جدا جدا غور کرنے کا موقع ملتا ہے کہ ان میں سے کونسی بہتر ہے یا ان دونوں کی تائید ایسے دلائل سے ہوتی ہے جو جداگانہ ہر ایک کے مناسب ہیں۔ ہم کو اس بات کا کبھی یقین کامل نہیں ہو سکتا کہ جس رائے کی مزاحمت میں پابند رہتے ہیں ہم کوشش کرتے ہیں وہ غلط ہی ہے اور اگر یقین بھی ہو کہ وہ غلط ہے تو بھی اس کی مزاحمت اور اس کا انسداد بُرائی سے خالی نہیں۔
فرض کرو کہ جس رائے کا بند کرنا ہم چاہتے ہیں حقیقت میں وہ رائے صحیح و درست ہے، اور جو لوگ اس کا انسداد چاہتے ہیں وہ اس کی درستی اور صحت سے منکر ہیں مگر غور کرنا چاہیے کہ وہ لوگ یعنی اس رائے کے بند کرنے والے، ایسے نہیں ہیں جن سے غلطی اور خطا ہونی ممکن نہ ہو تو ان کو اس بات کا حق نہیں ہے کہ وہ اس خاص معاملہ کو تمام انسانوں کے لئے خود فیصل کریں اور اور شخصوں کو اپنی رائے کام میں لانے سے محروم کردیں۔
کسی مخالف رائے کی سماعت سے اس وجہ سے انکار کرنا

کہ ہم کو اس سے غلط ہونے کا یقین ہے، گویا یہ کہنا ہے کہ ہمارا یقین، یقین کامل کا رتبہ رکھتا ہے، اور اُس پر بحث و گفتگو کی ممانعت کرنا انبیاء سے بھی بڑھ کر اپنا رتبہ ٹھہرانا ہے اور اپنے تئیں ایسا سمجھنا ہے کہ ہم سے سہو و خطا کا ہونا ناممکن ہے۔

اگرچہ سب اس بات کا اقرار کرتے ہیں کہ ہم سے سہو و خطا ہونی ممکن ہے، مگر بہت ہی کم آدمی ایسے ہوں گے جو اس کا خیال رکھنا اور از روئے عمل کے بھی اس کی احتیاط کرنا ضرور سمجھتے ہوں اور عملی طور پر اس بات کو تسلیم کرتے ہوں کہ جس رائے کی صحت کا ان کو خوب یقین ہے، شاید وہ اسی سہو و خطا کی مثال ہو جس کا ہونا وہ اپنے سے ممکن سمجھتے ہیں۔

جو لوگ کہ دولت، یا منصب اور حکومت، یا علم کے سبب غیر محدود تعظیم و ادب کے عادی ہوتے ہیں وہ تمام معاملات میں اپنی رایوں کے صحیح ہونے پر یقین کامل رکھتے ہیں اور اپنے میں سہو و خطا ہونے کا احتمال بھی نہیں کرتے، اور جو لوگ ان سے کسی قدر زیادہ خوش نصیب ہیں، یعنی وہ کبھی کبھی اپنی رایوں پر اعتراض اور حجت اور تکرار ہوتے ہوئے سنتے ہیں کچھ کچھ اس بات کے عادی ہوتے ہیں کہ جب غلطی پر ہوں تو متنبہ ہونے پر اس کو چھوڑ دیں اور درست بات کو مان لیں اگرچہ ان کو اپنی ہر ایک رائے کی درستی پر یقین کامل تو نہیں ہوتا مگر ان رایوں کی درستی پر

ضرور یقین ہوتا ہے جن کو وہ لوگ جو ان کے اردگرد رہتے ہیں یا
ایسے لوگ جن کی بات کو وہ نہایت ادب و تعظیم کے قابل سمجھتے ہیں
ان رایوں کو تسلیم کرتے ہیں۔

یہ ایک قاعدہ کلیہ ہے کہ جو شخص جسقدر اپنی ذاتی رائے
پر اعتماد نہیں رکھتا وہ شخص اسی قدر دنیا کی رائے پر عموماً زیادہ
تر اعتماد رکھتا ہے، جس کو بعض اصطلاحوں میں جمہور کی رائے یا
جمہور کا مذہب کہا جاتا ہے، مگر یہ بات سمجھی جاتی ہے کہ ایسے
لوگوں کے نزدیک دنیا سے یا جمہور سے کیا مراد ہوتی ہے۔ ہر ایسے
شخص کے نزدیک دنیا سے اور جمہور سے وہ چند اشخاص معدود
مراد ہوتے ہیں، جن سے وہ اعتقاد رکھتا ہے، یا جن سے وہ ملتا
جلتا ہے، مثلاً اس کے دوستوں یا ہم رایوں کا فرق یا اس کی
ذات برادری کے لوگ یا اس درجہ و رتبہ کے لوگ۔ پس اس
کے نزدیک تمام دنیا اور جمہور کے معنی انہی میں ختم ہو جاتے ہیں،
اور اس لئے وہ شخص اس رائے کو دنیا کی یا جمہور کی رائے سمجھ کر
اس کی درستی پر زیادہ تر یقین کرتا ہے۔

اس ہیئت مجموعی رائے کا جو اعتماد اور یقین اس کو زیادہ ہوتا
ہے اور ذرا بھی اس میں لغزش نہیں آتی، اس کا سبب یہ ہی ہوتا
ہے کہ وہ اس بات سے واقف نہیں ہوتا کہ اس زمانہ سے پہلے
اور زمانوں کے اور ملکوں کے اور فرقوں کے اور مذہبوں کے لوگ

ان میں کیا رائے رکھتے تھے اور اب اور ملکوں اور فرقوں و مذہبوں کے لوگ کیا رائے رکھتے ہیں۔ ایسے شخص کا یہ حال ہوتا ہے کہ وہ اس بات کی جواب دہی کو کہ درحقیقت وہ راہ راست پر چلتا ہے اپنی فرضی دنیا یا جمہور کے ذمہ ڈالتا ہے۔

پس جو کچھ اس کی رائے یا اس کا حال ہو کچھ بھی اعتبار اور یقین کے لائق نہیں ہے اس لئے کہ جن وجوہات سے وہ شخص بسبب مسلمان خاندان میں پیدا ہونے کے اس وقت بڑا مقدس مسلمان ہے۔ انہی وجوہات سے اگر وہ عیسائی خاندان یا ملک یا بت پرست خاندان یا ملک میں پیدا ہوتا تو وہ بھلا چنگا عیسائی یا بت پرست ہوتا۔ وہ مطلق اس بات کا خیال نہیں کرتا کہ جس طرح کسی خاص شخص کا خطا میں پڑنا ممکن ہے، اسی طرح اس کی فرضی دنیا اور خیالی جمہور کی تو کیا حقیقت ہے، زمانہ کے زمانہ کا اور اس سے بھی بہت بڑی دنیا کا خطا میں پڑنا ممکن ہے۔

تاریخ سے اور علوم موجودہ سے بخوبی ظاہر ہے کہ ہر زمانہ میں ایسی ایسی رائیں قائم ہوئیں اور مسلّم قرار پائیں جو اس کے بعد کے زمانہ میں صرف غلط ہی نہیں بلکہ سراسر لغو و مہمل سمجھی گئیں۔ اور یقیناً اس زمانہ میں بھی بہت سی ایسی رائیں مروج ہوں گی جو کسی آئندہ زمانہ میں اسی طرح مردود اور نامعقول ٹھہریں گی جیسے کہ بہت سی وہ رائیں جو اگلے زمانہ میں عام طور پر مروج تھیں اور اب مردود ہو گئی ہیں۔

اس تقریر پر اعتراض ہو سکتا ہے کہ جو لوگ مخالف رائے کو غلط اور مضر سمجھ کر اس کی مزاحمت کرتے ہیں، اس سے ان کا مطلب اس بات کا دعوٰی کرنا کہ وہ غلطی سے آزاد و بری ہیں نہیں ہوتا بلکہ اس سے اس کا فرض ادا کرنا مقصود ہوتا ہے۔ جو اُن پر باوصف قابل سہو و خطا ہونے کے، اپنے ایمان اور اپنے یقین کے مطابق عمل کرنے کا ہے۔

اگر لوگ اس وجہ سے اپنی رایوں کے موافق کاربند نہ ہوں کہ شاید وہ غلط ہوں، تو کوئی شخص اپنا کوئی کام بھی نہیں کر سکتا۔ لوگوں کا یہ فرض ہے کہ حتی المقدور وہ اپنی نہایت درست رائیں قائم کریں اور بغور ان کو قرار دیں اور جب اُن کی درستی کا بخوبی یقین ہو جاوے تو اس کے مخالف رایوں کے بند کرنے اور مزاحمت کرنے میں کوشش کریں۔ آدمیوں کو اپنی استعداد و قابلیت کو نہایت عمدہ طور سے برتنا چاہیے، یقین کامل کسی امر میں نہیں ہو سکتا۔ مگر ایسا یقین ہو سکتا ہے جو انسان کے مطالب کے لئے کافی ہو، انسان اپنی کارروائی کے لئے اپنی رائے کو درست و صحیح سمجھ سکتے ہیں اور ان کو ایسا ہی سمجھنا چاہیے اور وہ اس سے زیادہ اور کوئی بات اس صورت میں اختیار نہیں کرتے کہ جبکہ وہ خراب آدمیوں کو ممانعت کرتے ہیں کہ ایسی رایوں کے شائع کرنے سے جو ان کے نزدیک فاسد اور مضر ہیں لوگوں کو خراب یا بد اخلاق یا بدمذہب

نہ کریں۔

مگر مخالف رائے کو بند کرنے میں صرف اتنا ہی نہیں ہوتا کہ انہوں نے اپنے تئیں قابل سہو و خطا سمجھ کر اپنے ایمان اور اپنے یقین کے موافق عمل کیا ہے بلکہ اس سے بہت زیادہ کیا جاتا ہے۔ اس بات میں کہ ایک رائے کو اس وجہ سے صحیح سمجھا جاوے کہ اس پر اعتراض اور حجت کرنے کا ہر طرح پر لوگوں کو موقع دیا گیا اور اس کی تردید نہ ہو سکی اور اس بات میں کہ ایک رائے کو اس وجہ سے مان لیا گیا اور اس کی تردید کی کسی کو اجازت نہیں ہوئی زمین و آسمان کا فرق ہے۔ پس مخالف رایوں کی مزاحمت کرنے والے اپنی رائے کو اس وجہ سے صحیح نہیں سمجھتے کہ اس کی تردید نہیں ہو سکی بلکہ اس لئے صحیح ٹھہراتے ہیں کہ اس کی تردید کی اجازت نہیں ہوئی حالانکہ جس بات کی وجہ سے ہم بطور جائز اپنی رائے کو عملدار ہونے کے لئے درست قرار دے سکتے ہیں۔ وہ صرف یہی ہے کہ لوگوں کو اس بات کی کامل آزادی ہو کہ وہ اس رائے کے برخلاف کہیں اور اس کو غلط ثابت کریں۔ اس کے سوا اور کوئی صورت نہیں ہے کہ انسان جس کے قوائے عقلی اور اس کی قوی کامل نہیں ہیں اپنے آپ کو راہ راست پر ہونے کا یقین کر سکے۔

اہل مذاہب جو صرف اپنے معتقدین کی پیروی ہی کو راہ راست

اجازت نہ دیں کہ جس طرح پر اُن کا عملدرآمد اور چال چلن یا اعتقاد
اور خیال ہے وہ صحیح طور سے اُن کے معتقدبہ کی پیروی ہے یا نہیں
اس وقت تک وہ بھی اپنے آپ کو راہ راست پر ہونے کا یقین
نہیں کر سکتے۔

انسان کی پچھلی حالتوں کو موجودہ حالتوں سے مقابلہ کرنے پر
معلوم ہوتا ہے کہ ہر زمانہ میں انسانوں کا یہی حال ہے کہ سو میں سے
ایک ہی شخص اس قابل ہوتا ہے کہ کسی دقیق معاملہ پر رائے دے
اور ننانوے ۹۹ شخص اس میں رائے دینے کی لیاقت نہیں رکھتے، مگر
اس ایک آدمی کی رائے کی عمدگی بھی صرف اضافی ہوتی ہے اس
لئے کہ اگلے زمانہ کے لوگوں میں اکثر آدمی جو سمجھ بوجھ اور لیاقت
میں مشہور تھے ایسی رائیں رکھتے تھے کہ جن کی غلطی اب بخوبی روشن
ہو گئی ہے۔ بہت سی ایسی باتیں ان کو پسندیدہ اور اُن کے عملدرآمد
تھیں جن کو اب کوئی بھی ٹھیک اور درست نہیں سمجھتا۔

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ انسانوں میں ہمیشہ معقول رایوں
اور پسندیدہ رایوں کو غلبہ رہتا ہے مگر اس کا سبب بجز انسان کی
عقل و فہم کی ایک عمدہ صفت کے جو نہایت ہی پسندیدہ ہے اور
کوئی نہیں اور وہ صفت یہ ہے کہ انسان کی غلطیاں اصلاح کی
صلاحیت رکھتی ہیں یعنی انسان اپنی غلطیوں کو مباحثہ اور تجربہ کے
ذریعہ سے درست کر لینے کی قابلیت رکھتا ہے۔ پس انسان کی

رائے کی تمام قوت اور قدر و منزلت کا حصر اس بات پر ہے کہ جب وہ غلط ہو تو صحیح کی جا سکتی ہے مگر اس پر اعتماد اسی وقت کیا جا سکتا ہے جبکہ اس کے صحیح کرنے کے ذریعے ہمیشہ برتاؤ میں رکھے جاویں۔

خیال کرنا چاہیے کہ جس آدمی کی رائے حقیقت میں اعتماد کے قابل ہے اس کی وہ رائے اس قدر و منزلت کو کسی وجہ سے پہونچی ہے اس وجہ سے پہونچی ہے کہ اس نے ہمیشہ اپنی طبیعت پر اس بات کو گوارا رکھا ہے کہ اس کی رائے پر نکتہ چینیاں کی جاویں اور اس نے اپنا طریقہ یہ ٹھہرایا ہے کہ اپنے مخالف کی رائے کو ٹھنڈے دل سے سُننا، اور اس میں جو کچھ درست اور واجب تھا اس سے خود مستفید ہونا، اور جو کچھ اس میں غلط اور ناواجب تھا اس کو سمجھ لینا، اور موقع پر اس غلطی سے اوروں کو بھی آگاہ کر دینا۔ ایسا شخص گویا اس بات کو عملی طور پر تسلیم کرتا ہی کہ جس طریقہ سے انسان کسی معاملہ کے کل مدارج کو جان سکتا ہی وہ صرف یہ ہے کہ اس کی بابت ہر قسم کی رائے کے لوگوں کی گفتگو کو سُنے، اور جن جن طریقوں سے ہر سمجھ اور طریقے اور طبیعت کے آدمی اس معاملہ پر نظر کریں، ان سب طریقوں کو سوچے اور سمجھے۔ کسی دانا آدمی نے اپنی دانائی بجز اس طریقے کے اور کسی طرح پر حاصل نہیں کی۔

انسان کی عقل و فہم کا خاصہ یہی ہے کہ وہ اس طور سے ہوا اور
کسی طور سے مہذب اور معقول ہو ہی نہیں سکتی اور صرف اس بات
کی مستقل عادت کے سوا کہ اپنی رائے کو اوروں کی رایوں سے
مقابلہ کر کے اس کی اصلاح اور تکمیل کیا کرے اور کوئی بات اس
پر اعتماد کرنے کی وجہ متصور نہیں ہو سکتی۔ اس لئے کہ اس صورت
میں اس شخص نے لوگوں کی ان تمام باتوں کو جو اس کے برخلاف
کہہ سکتے تھے بخوبی سُنا اور تمام معترضوں کے سامنے اپنی رائے
کو ڈالا اور بعوض اس کے کہ مشکلاتوں اور اعتراضوں کو چھپا دے
خود اس نے جستجو کی اور ہر طرف سے جو کچھ روشنی پہونچی اس کو
بند نہیں کیا۔ تو ایسا شخص البتہ اس بات کے خیال کرنے کا استحقاق
رکھتا ہے کہ میری رائے ایسے شخص یا اشخاص سے جنہوں نے
اپنی رائے کو اس طرح پر پختہ نہیں کیا بہتر و فائق ہے۔
جس شخص کو اپنی رائے پر کسی قدر بھروسا کرنے کی خواہش ہو
یا یہ خواہش رکھتا ہو کہ عام لوگ بھی اس کو تسلیم کریں اس کا طریقہ
بجز اس کے اور کچھ نہیں ہے کہ وہ اپنی رائے کو عام مباحثہ اور
ہر قسم کے لوگوں کو اعتراضوں کے لئے حاضر کرے اگر "نیوٹن"
کی حکمت اور ہیئت اور مسئلہ ثقل پر اعتراض اور حجت کرنے کی
اجازت نہ ہوتی تو دنیا اس کی صحت اور صداقت پر ایسا پختہ یقین
نہ کر سکتی جیسا کہ اب کرتی ہے۔ کیا کچھ مخالفت ہے جو لوگوں نے

کی عقل و فہم اس کے دریافت کرنے کے قابل ہو گی۔ اور اس
اثناء میں ہم اس بات کو یقین کر سکتے ہیں کہ ہم راستی اور صداقت
کے اس قدر قریب پہونچ گئے ہیں جس قدر کہ ہمارے زمانہ میں ممکن
تھا۔ غرض کہ ایک خطا دار وجود، جس کو انسان کہتے ہیں اگر کسی
امر کی نسبت کسی قدر یقین حاصل کر سکتا ہے تو اس کا یہی طریقہ ہے
جو بیان ہوا۔

مگر ایک بات بہت بڑا دھوکا ہے جو انسانوں کو اور بعض دفعہ
نیک گورنمنٹوں کو بھی آزادی رائے کے بند کرنے پر مائل کرتا ہے
اور وہ سود مندی کا ہے، جس کو غلط اور جھوٹا نام مصلحت عام
کا دیا گیا ہے۔ اور وہ مسئلہ یہ ہے کہ کسی رائے یا مسئلے یا عقیدے
کی سچائی اور صحت پر بحث کرنے سے اس لئے ممانعت کی جاتی ہے
کہ گو وہ فی نفسہ کیسا ہی ہو مگر اس سے عام لوگوں کا پابند رہنا
نہایت مفید اور باعث صلاح و فلاح عام لوگوں کا ہے۔ اور
فی زماننا ہذا ہندوستان میں اور خصوصاً مسلمانوں میں یہ رائے
بکثرت رائج ہے بلکہ اس گناہ کے کام کو ایک نیک کام تصوّر
کیا جاتا ہے۔

اس رائے کا نتیجہ یہ ہے کہ مباحثے اور رایوں کی آزادی کا
بند کرنا اس مسئلے یا عقیدے کی صحت اور سچائی پر منحصر نہیں ہے
بلکہ زیادہ تر مفید عام ہونے پر منحصر ہے۔ مگر افسوس ہے کہ ایسی رائے

اس دانا حکیم کے ساتھ نہیں کی؟ اور کونسی مذہبی لعن وطعن ہے جو
اس سچے اور سچی رائے رکھنے والے حکیم کو نہیں دی گئی؟ مگر غور
کرنا چاہیئے کہ اس کا نتیجہ کیا ہوا؟ یہ ہوا کہ آج تمام دنیا کیا دانا
اور کیا نادان کیا حکیم اور کیا متعصب اہل مذہب سب اسی کو
تسلیم کرتے ہیں اور اسی کو سچ جانتے ہیں اور مذہبی عقائد سے بھی
زیادہ اس کی سچائی دلوں میں بیٹھی ہے۔

بغیر آزادی رائے کے کسی چیز کی سچائی، جہاں تک کہ اس کی
سچائی دریافت ہونی ممکن ہے، دریافت نہیں ہو سکتی۔ جن اعتقادوں
کو ہم نہایت جائز و درست سمجھتے ہیں، اُن کے جواز و درستی کی اور
کوئی سند اور بنیاد بجز اس کے نہیں ہو سکتی کہ تمام دنیا کو اختیار دیا
جاوے کہ وہ ان کو بے بنیاد ثابت کریں۔ اگر وہ لوگ ایسا قصد
نہ کریں یا کریں اور کامیاب نہ ہوں، تو بھی ہم ان پر یقین کامل رکھنے
کے مجاز نہیں ہیں۔ البتہ ایسی اجازت دینے سے ہم نے ایک ایسا
نہایت عمدہ ثبوت ان کی صحت کا حاصل کیا ہے جو انسانوں کی
عقل کی حالت موجودہ سے ممکن تھا کیونکہ ایسی حالت میں ہم نے
کسی ایسی بات سے غفلت نہیں کی جس سے صحیح صحیح بات ہم تک
نہ پہنچ سکتی ہو اور اگر امر مذکورہ پر مباحثہ کی اجازت جاری
رہے تو ہم امید کر سکتے ہیں کہ اگر کوئی بات اس سے بہتر اور سچ
اور صحیح ہے تو وہ اس وقت ہم کو حاصل ہو جاوے گی جبکہ انسانوں

رکھنے والے یہ نہیں سمجھتے کہ وہی دعویٰ سابق یعنی اپنے آپ کو ناقابل سہو وخطا سمجھنے کا، جس سے انھوں نے توبہ کی تھی، پھر پھر اک بیٹھ قائم ہوجاتا ہے۔ صرف اتنا فرق ہوتا ہے کہ پہلے وہ دعویٰ ایک بات پر تھا، اب وہی دعویٰ دوسری بات پر ہے: یعنی پہلے اس مسئلے یا عقیدے کے صحیح ہونے پر تھا، اور اب اس کے مفید عام ہونے پر ہے، حالانکہ یہ بات بھی کہ وہ مسئلہ یا عقیدہ مفید عام ہے، اسی قدر بحث و مباحثہ کا محتاج ہے جس قدر کہ وہ اصل مسئلہ یا عقیدہ محتاج ہے۔

ایسی رائے رکھنے والے اس غلطی پر ایک اور دوسری غلطی یہ کرتے ہیں: جبکہ وہ یہ کہتے ہیں کہ ہم نے صرف اس کی اصلیت اور سچائی پر بحث کی ممانعت کی ہے، اس کے مفید عام ہونے کی بحث پر ممانعت نہیں کی اور یہ نہیں سمجھتے کہ رائے کی صداقت خود اس کے مفید ہونے کا ایک جزو ہے۔ ممکن نہیں کہ ہم کسی رائے کے مفید ہونے پر بغیر اس کی صحت اور سچائی ثابت کیے بحث کرسکیں۔ اگر ہم یہ بات جاننی چاہتے ہیں کہ آیا فلاں بات لوگوں کے حق میں مفید ہے یا نہیں تو کیا یہ ممکن ہے کہ اس بات پر توجہ نہ کریں کہ آیا وہ بات سچ اور صحیح و درست بھی ہے یا نہیں؟ ادنیٰ اور اعلیٰ سب اس بات کو قبول کریں گے کہ کوئی رائے یا مسئلہ یا اعتقاد جو صداقت اور راستی کے برخلاف ہے دراصل کسی کے لئے مفید

نہیں ہو سکتا۔

یہ تمام مباحثہ جو ہم نے کیا، ایسی صورت سے متعلق تھا کہ رائے مروّجہ اور تسلیم شدہ کو ہم نے غلط اور اس کے برخلاف رائے کو جس کا بند رکھنا لوگ چاہتے تھے صحیح و درست فرض کیا تھا۔ اب اس کے برخلاف شق کو اختیار کرتے ہیں، یعنی یہ فرض کرتے ہیں کہ رائے مروجہ اور تسلیم شدہ صحیح ہے اور اس کے برخلاف رائے جس کا بند کرنا چاہتے ہیں غلط اور نادرست ہے اور اس بات کو ثابت کرتے ہیں کہ اس غلط رائے کو بھی بند کرنا خالی برائی اور نقصان سے نہیں۔

ہر ایک شخص کو گو اس کی رائے کیسی ہی زبردست اور مضبوط ہو اور وہ کیسی ہی مشکل اور نارضامندی سے اپنی رائے کے غلط ہونے کے امکان کو تسلیم کرے یہ بات خوب یاد رکھنی چاہیے کہ اگر اس رائے پر بخوبی تمام اور نہایت بے باکی سے بے دھڑک مباحثہ نہیں ہو سکتا تو وہ ایک مردہ اور مردار رائے قرار دی جاویگی نہ ایک زندہ اور سچی حقیقت! اور وہ کبھی ایسی حق اور سچ بات قرار نہیں پا سکتی جس کا اثر ہمیشہ لوگوں کی طبیعتوں پر رہے۔

گزشتہ اور حال کے زمانہ کی تاریخ پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ بعضی دفعہ ظالم گورنمنٹوں نے بھی نہایت سچی اور صحیح بات کے رواج پر کوشش کی، الا ان کے ظلم نے اس پر آزادی سے

مباحثہ کی اجازت نہیں دی۔ اور بہت سی ایسی مثالیں بھی موجود ہیں کہ نیک اور تربیت یافتہ گورنمنٹ نے نہایت سچی اور صحیح بات کا رواج دینا چاہا اور لوگوں نے یا تو اس خیال سے کہ ہمارے مباحثے اور دلائل کو اس رائے میں کچھ مداخلت نہیں ہے یا کوئی التفات نہیں کرتا، از خود مباحثہ کو نہیں اٹھایا اپنے وہمی خوف سے یا ارکین گورنمنٹ کی بد مزاجی کے ڈر سے، یا ان کے خلاف رائے کے کوئی بات نہ کہنی مصلحتِ وقت سمجھ کر، یا یہ خیال کر کر کہ گورنمنٹ کے یا کسی کے برخلاف بحث کرنا خیر خواہی نہیں ہے، مباحثہ کو ترک کر دیا تو اس کا نتیجہ بجز اس کے اور کچھ نہیں ہوا کہ اس تجویز نے کسی کے دلوں میں مطلق اثر نہیں کیا، اور ایک مردہ رائے سے زیادہ اور کچھ مرتبہ لوگوں کے دلوں میں نہیں پایا۔

یہ بات کہ سچی اور درست رائے بے مباحثہ و دلیل کے بھی طبیعتوں میں بیٹھ جاتی ہے اور گھر کر لیتی ہے، ایک خوش آیند مگر غلط آواز ہے۔ دنیا کو دیکھو کہ وہ گروہ کے گروہ ایک دوسرے کی متناقض رائے پر جمے ہوئے ہیں اور وہ متناقض رائیں ان کے دلوں میں گھر کئے ہوئے ہیں۔ پھر کیا وہ دونوں متناقض رائیں سچی اور صحیح ہیں؟ ہاں اس میں شک نہیں کہ بہت سی باتیں بے سمجھے اور بغیر دلیل کے اور بغیر مباحثہ کے لوگوں کے دلوں میں گھر کر جاتی ہیں مگر ان کا صحیح و درست ہونا ضرور نہیں۔ بہرحال میں کوئی ایسی عجازی

کرامات نہیں ہے کہ وہ از خود دلوں میں بیٹھ جاوے۔ اس میں کچھ کرامات ہے وہ صرف اسی قدر ہے کہ مباحثہ کا اس کو خوف نہیں۔ صحیح رائے بھی اگر بلا دلیل و مباحثہ دل میں گھر کرے تو وہ سچی رائے نہیں کہلاوے گی بلکہ تعصب اور جہل مرکب اس کا مناسب نام ہوگا۔ مگر ایسا طریقہ حق اور صحیح بات کے قبول کرنے کا ایک ذی عقل مخلوق کے لئے جیسا کہ انسان ہے شایان نہیں اور نہ یہ طریقہ راستی و حق کے پہچاننے کا ہے۔ بلکہ جو حق بات اس طرح پر قبول کی جاتی ہے وہ ایک خیال فاسد اور باطل ہے اور جن باتوں کو حق فرض کر لیا ہے ان کا اتفاقیہ قبول کر لیا ہے۔

نہایت صحیح اور بالکل سچ تو یہ بات ہے کہ جس شخص نے جو رائے یا مذہب اختیار کر لیا ہے وہی شخص اس کا جواب دہ ہے۔ اس رائے کے موجد یا اس مذہب کے پیشوا اور معلم اور مجتہد کچھ اس کے ذمہ دار نہیں ہیں۔ مگر مسلمانوں نے اس آفتاب سے بھی زیادہ روشن مسئلہ سے آنکھ بند کر لی ہے۔ اب جو بڑے بڑے عالم فقیہ اور دانا رہ گئے ہیں، ان کا یہ حال ہے کہ کسی چیز کی حقیقت سے کیا مسائل علمی اور کیا عقائد مذہبی میں کچھ بھی واقفیت نہیں رکھتے جس شخص سے کسی بات کی حقیقت پوچھو اگر وہ بڑا ہی عالم ہے تو بجز اس کے کہ فلاں شخص نے یہ لکھا ہے اور کچھ نہیں بتا سکتا۔ تمام غلطی کا مزہ اور تمام عقیدوں کا اثر دل سے جاتا رہا۔ پس آزادی

رائے کے قائم نہ رہنے کے یہ عمدہ اثر ہیں جن کو ہم اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں۔

آزادی رائے غیر مفید ہونے کے ثبوت میں یہ بات اکثر پیش کی جاتی ہے کہ آزادی رائے سے جس کے ساتھ مباحثہ لازم و ملزوم ہے کسی رائے کے حق یا سچ ہونے کا فیصلہ ممکن نہیں بلکہ ہر ایک فریق کو اپنی اپنی رائے پر اور زیادہ پختگی اور اصرار ہو جاتا ہے میں بھی اس بات کا اقرار کرتا ہوں اور اس بات کو تسلیم کرتا ہوں۔ در حقیقت تمام رایوں کا یہ خاصہ ہے کہ وہ خاص خاص فرقوں کی رائیں ہو جاتی ہیں۔ بحث و مباحثہ کی کمال آزادی سے بھی اس کا کچھ تدارک نہیں ہو سکتا، بلکہ اس سے اور زیادتی ہوتی جاتی ہے اور حق کی یہ کیفیت ہو جاتی ہے کہ بعوض اس کے کہ لوگ اس کو سمجھیں اور بوجھیں، اسی وجہ سے اس کو نہیں سوچتے سمجھتے بلکہ بے سوچے اور بے سمجھے نہایت زور شور سے رد کرتے ہیں کہ وہ ایسے لوگوں کا قول ہے جن کو وہ اپنی مخالف جانتے ہیں یا ان سے نفرت رکھتے ہیں۔ مگر یہ بھی خوب جان لینا چاہیئے کہ آپس میں رایوں کے اختلاف اور مباحثہ سے انہی متعصب گروہوں کو جن کے باہم بحث ہوتی ہر چند ان فائدہ نہیں ہوتا بلکہ اس کا عمدہ اور مفید اثر ان لوگوں پر ہوتا ہے جو اس کے دیکھنے سننے والے ہیں اور جن کی طبیعتوں میں وہ جذبہ اور حرارت اور خود غرضی اور طرفداری نہیں ہوتی جیسے کہ ان

مخالف فرقوں کے حامیوں میں ہوتی ہے اور جبکہ رفتہ رفتہ ان
متعصبوں کی بھی حرارت کم ہو جاتی ہے تو جو حق بات ہے وہ اس
کے صحیح ہونے کا اقرار اپنے دل میں یا اپنے خاص دوستوں میں
چپکے چپکے کرنے لگتے ہیں، گو کہ علانیہ کبھی اس کا اقرار نہ کریں۔
سچ بات پر سخت نزاع کا ہونا کچھ برائی یا نقصان
کی بات نہیں بلکہ اس کا انسداد بہت بڑے نقصان کی بات
ہے۔ جبکہ لوگ طرفین کے دلائل سننے پر مجبور ہوتے ہیں تو ہمیشہ
انصاف کی امید ہوتی ہے مگر جبکہ وہ صرف یک طرفہ بات سنتے
ہیں تو اس صورت میں غلطیاں سختی پکڑ کر تعصب بن جاتی ہیں اور
سچ میں بھی سچ کا اثر اس لئے باقی نہیں رہتا کہ اس میں مبالغہ
ہوتے ہوتے وہ خود ایک جھوٹ بن جاتا ہے۔
انصاف کی قوت جو انسان میں ہے وہ اسی وقت بخوبی
کام آتی ہے کہ ہر ایک معاملہ کے دو پہلوؤں کے حامی اور معاون
تصفیہ کے وقت روبرو موجود ہوں، اور وہ دونوں ایسے
زبردست ہوں کہ اپنے اپنے دلائل اور وجوہات کی سماعت
پر لوگوں کو گویا مجبور کر دیں اور سوا اس کے اور کوئی صورت
حق کے حاصل کرنے کی نہیں ہے۔
رائے کی آزادی پر ایک اور چیز جس کو لوگ مسئلہ کہتے ہیں
کبھی کبھی مزاحمت پہونچاتی ہے۔ اکثر ہوتا ہے کہ بحث کرتے

اپنی اپنی تقریر کی تائید میں کسی مشہور شخص کے قول کی سند لاتے ہیں
حالانکہ کسی شخص کی سند پر اپنی رائے کو منحصر رکھنا خود آزادی رائے
کے برخلاف چلنا ہے۔

ہم کسی کے قول کو صحیح اور سچ سمجھتے ہیں تو اس کے قول کو پیش
کرنا کچھ مفید نہیں ہے، بلکہ ہم کو وہ دلیلیں پیش کرنی چاہئیں جن سے
اس قول کو ہم نے صحیح مانا ہے۔ اگر سقراط و بقراط نے کوئی ایسی
بات کہی ہے جو درحقیقت صحیح نہیں ہے تو وہ اُن کے کہنے سے
صحیح نہیں ہو جانے کی اور اگر کسی جاہل نے کوئی صحیح بات کہی ہے
تو وہ اس لئے کہ کسی جاہل نے کہی ہے غلط نہیں ہو جانے کی:

مرد باید کہ گیرد اندر گوش
در نوشت است پند بر دیوار

I read all the topics of this book thoroughly. The book is really full of advises particularly relating to slave countries like our J&K State. All the Kashmiris should follow the path narrated in the book. Really we will achieve our end & get freedom from Indian tyranny, soon.

۱۵۔ تہذیب

ہم دریافت کیا چاہتے ہیں کہ سولزیشن یا تہذیب کیا چیز ہے؟ اور کن کن چیزوں سے علاقہ رکھتی ہے؟ کیا یہ کوئی بنائی ہوئی چیز ہے؟ یا قدرت نے انسان کی فطرت میں اس کو پیدا کیا ہے؟ اس کے معنی کیا ہیں؟ کیا یہ کوئی اصطلاح ہے جس کو لوگوں نے یا فیلسوفوں نے مقرر کیا ہے؟ یا یہ ایسی چیز ہے کہ اس کا مفہوم، اور جن جن چیزوں سے اس کا تعلق ہے، قانون قدرت میں پایا جاتا ہے؟ اس امر کے تصفیہ کے لئے انسان کے حالات پر ہم کو نظر کرنی چاہیے۔ اگر تہذیب انسان میں ایک فطرتی چیز ہے، تو وحشیوں میں، شہریوں میں سب میں اس کا نشان ملے گا۔ گو اس کی صورتیں مختلف دکھائی دیتی ہوں۔ الا سب کی جڑ ایک ہی ہوگی۔

انسان میں یہ ایک فطرتی بات ہے کہ وہ اپنے خیال کے مواقق کسی چیز کو پسند کرتا ہے اور کسی کو ناپسند، یا یوں کہو کہ کسی چیز کو اچھا ٹھہراتا ہے، اور کسی چیز کو برا۔ اور اس کی طبیعت اس طرف مائل ہے کہ اس بری چیز کی حالت کو ایسی حالت سے تبدیل کرے جس کو وہ اچھا سمجھتا ہے۔ یہی چیز سولزیشن کی جڑ ہے جو انسانوں کو ہر گروہ میں اور ہر ایک میں پائی جاتی ہے۔ اس تبادلہ کا نام سولزیشن یا تہذیب ہے، اور کچھ شبہہ نہیں کہ یہ میلان یا یہ خواہش تبادلہ انسان میں قدرتی اور فطرتی ہے۔

سولزیشن یا تہذیب کی طرف انسان کی طبیعت کے مائل ہونے کے وہ اصول ٹھہرے، اچھا یا برا، اور برے کو اچھا کرنا سولزیشن یا تہذیب ٹھہری مگر اچھا اور

بُرا قرار دینے کے مختلف اسباب خلقی اور خلقی، ملکی اور تمدنی، ایسے ہوتے ہیں
جن کے سبب اچھا اور برا ٹھہرانے میں یا یوں کہو کہ قوموں کی سولزیشن میں اختلاف
پڑ جاتا ہے۔ ایک قوم جس بات کو اچھا سمجھتی ہے اور داخل تہذیب جانتی ہے دوسری
قوم اسی بات کو بہت برا و وحشیانہ حرکت قرار دیتی ہے یہ اختلاف سولزیشن کا قوموں کے
باہم ہوتا ہے، اشخاص میں نہیں ہوتا، یا بہت ہی کم ہوتا ہے۔

جبکہ ایک گروہ انسانوں کا کسی جگہ اکٹھا ہو کر بستا ہے تو اکثر ان کی ضرورتیں اور ان
کی حاجتیں، ان کی غذائیں، اور ان کی پوشاکیں، ان کی معلومات اور ان کے خیالات
ان کی مسرت کی باتیں اور ان کی نفرت کی چیزیں سب یکساں ہوتی ہیں اور اسی لیے
برائی اور اچھائی کے خیالات بھی سب یکساں پیدا ہوتے ہیں، اور برائی کو اچھائی
سے تبدیل کی خواہش سب میں ایک ہی ہوتی ہے اور یہی مجموعی خواہش تبادلہ یا
مجموعی خواہش سے وہ تبادلہ اس قوم یا گروہ کی سولزیشن ہے۔ مگر جبکہ مختلف
گروہیں مختلف مقامات میں بستی ہیں، تو ان کی حاجتیں اور خواہشیں بھی مختلف ہوتی ہیں۔
اور اسی سبب سے تہذیب کے خیالات بھی مختلف ہوتے ہیں۔ مگر ضرور کوئی چیز ایسی
بھی ہوگی جو سولزیشن کی ان مختلف حالتوں کا تصفیہ کر سکے۔

ملکی حالتیں، جہاں تک کہ وہ بوزو باتوں سے تعلق رکھتی ہیں، نہ فکر اور خیال
اور دماغ سے، ان کو تہذیب سے چنداں تعلق نہیں بلکہ صرف انسان کے خیال
کو اس سے تعلق ہے جس کے سبب وہ اچھا اور برا ٹھہراتا ہے اور جس باعث سے
خواہش تبادلہ تحریک میں آتی ہے، اور وہ تبادلہ واقع ہوتا ہے، جو سولزیشن
کہلاتا ہے پس سولزیشن کی مختلف حالتوں کا فیصلہ وہ اسباب کر سکتے ہیں جن کے

سبب سے اچھے اور برے کا خیال دل میں بیٹھتا ہے۔

اچھے اور برے کی جگہ میں اور لفظ استعمال کروں گا یعنی پسند اور ناپسند انگریزی میں ایک لفظ "ٹیسٹ" ہے جو نہایت وسیع معنوں میں مستعمل ہوتا ہے ہماری زبان میں بھی اس قسم کے لفظ ہیں جیسا کہ "مزا یا مذاق" مگر وہ استعمال میں ایسے خاص ہو گئے ہیں کہ ان سے وہ عام اور وسیع معنی خیال میں نہیں آتے اس واسطے میں اس لفظ کا ترجمہ پسند کرتا ہوں۔ پس پسند کا صحیح ہونا جو خیال کے صحیح ہونے کی فرع ہے بہت بڑا وسیلہ سولزیشن کی مختلف حالتوں کے تصفیہ کا ہے۔

خیال کی درستی اور پسند کی صحت کثرت معلومات پر اور علم طبیعیات سے بخوبی ماہر ہونے پر منحصر ہے۔ انسان کی معلومات کو روز بروز ترقی ہوتی جاتی ہے اور اس کے ساتھ ساتھ سولزیشن بھی بڑھتی ہے کیا عجب ہے کہ آئندہ کوئی ایسا زمانہ آوے کہ انسان کی تہذیب میں ایسی ترقی ہو کہ اس زمانہ کی تہذیب کو بھی وہ لوگ ایسے ہی ٹھنڈے دل سے دیکھیں جیسے کہ ہم لوگ اپنے سے اگلوں کی تہذیب کو ایک ٹھنڈے مگر مودب دل سے دیکھتے ہیں۔

تہذیب یا یوں کہو کہ بری حالت سے اچھی حالت میں لانا دنیا کی تمام چیزوں سے اخلاقی ہوں یا مادی یکساں تعلق رکھتا ہے اور تمام انسانوں میں پایا جاتا ہے تکلیف سے بچنے اور آسائش حاصل کرنے کا سب کو یکساں خیال ہے۔ ہنر اور اس کو ترقی دینا تمام دنیا کی قوموں میں موجود ہے۔ ایک تربیت یافتہ قوم زر و جواہر یاقوت و الماس سے نہایت نفیس نفیس خوبصورت زیور بناتی ہے۔ ناتربیت یافتہ قوم بھی کوڑیوں اور پوتھوں سے اپنی آرائش کا سامان بہم پہونچاتی ہے تربیت یافتہ قومیں اپنی آرائش میں سونے چاندی مونگے اور موتیوں کو کام میں لاتی ہیں۔ ناتربیت یافتہ قومیں جانوروں کے خوبصورت

اور نرگس بڑوں کو تیلیوں پر سے چھلے ہوئے سنہری پوست اور زمرد کے سے رنگ
کی باریک اور خوشنما گھاس میں گوندھ کر اپنے تئیں آراستہ کرتی ہیں۔ تربیت یافتہ قوموں کو بھی
لباس کی درستی کا خیال ہے، ناتربیت یافتہ قومیں بھی اس کی درستی پر مصروف ہیں۔ شاہی
مکانات نہایت عمدہ اور عالی شان بنتے ہیں۔ اور نفیس چیزوں سے آراستہ ہوتے ہیں
ناتربیت یافتہ قوموں کے جھونپڑے اور ان کے رہنے کے کھونپے درختوں پر باندھے ہوئے
ٹانڈہ زمین میں کھودی ہوئی کھوئیں بھی تہذیب سے خالی نہیں۔ معاشرت کی چیزیں،
تمدن کے قاعدے عیش و عشرت کی مجلسیں، خاطر و مدارات کے کام اور اخلاق و محبت
کی علامتیں دونوں میں پائی جاتی ہیں۔

علمی خیالات سے بھی ناتربیت یافتہ قومیں خالی نہیں بلکہ بعض چیزیں ان میں
زیادہ اصلی اور قدرتی طور سے دکھائی دیتی ہیں مثلاً شاعری جو ایک نہایت عمدہ فن
تربیت یافتہ قوموں میں ہے ناتربیت یافتہ قوموں میں عجیب عمدگی و خوبی سے پایا جاتا ہے
یہاں خیالی باتوں کو ادا کیا جاتا ہے اور وہاں دلی جوشوں اور اندرونی جذبوں کا اظہار ہوتا ہے
موسیقی نے تربیت یافتہ قوموں میں نہایت ترقی پائی ہے مگر ناتربیت یافتہ قوموں
میں بھی عجیب کیفیت دکھائی ہے۔ ان کی ادا اور آواز کی پھرت، اس کا گھٹاؤ
اور اس کا بڑھاؤ، اس کا ٹھہراؤ، اور اس کی اونچ، ہاتھوں کا بھاؤ اور پاؤں کی
دھمک زیادہ تر مصنوعی قواعد کی پابند ہے، مگر ناتربیت یافتہ قوموں میں یہ
سب چیزیں دلی جوش کی موجیں ہیں۔ وہ لے اور تال، راگ اور راگنی کو نہیں جانتے
مگر دل کی لہر ان کی لے، اور دل کی پھڑک ان کا تال ہے، ان کا غول باندھ کر کھڑا
ہونا، طبعی حرکت کے ساتھ اچھلنا، دل کی بیتابی سے جھکنا، اور پھر جوش میں آکر سیدھا

بڑھ جانا گو نزاکت اور طرز خیاگری سے خالی ہو مگر قدرتی جذبوں کی ضرور تصویر ہے۔

دلی جذبوں کو روکنا اور ان کو عمدہ حالت میں رکھنا تمام قوموں کے خیالات میں شامل ہے پس جس طرح کہ ہم تہذیب کا قدرتی لگاؤ تمام انسانوں میں پاتے ہیں اسی طرح اس کا تعلق عقلی اور مادی سب چیزوں میں سمجھتے ہیں۔ جس چیز میں کہ ترقی یعنی برائی سے اچھائی کی طرف رجوع یا ادنیٰ درجہ سے اعلیٰ درجہ کی طرف تحریک ہوسکتی ہے اسی سے تہذیب بھی متعلق ہے۔

پس سولزیشن یا تہذیب کیا ہے؟ انسان کے افعال ارادی اور جذبات نفسانی کو اعتدال پر رکھنا، وقت کو عزیز سمجھنا، واقعات کے اسباب کو ڈھونڈھنا اور ان کو ایک سلسلہ میں لانا، اخلاق اور معاملات اور معاشرت اور طریق تمدن اور علوم و فنون کو بقدر امکان قدرتی خوبی اور فطرتی عمدگی پر پہونچانا اور ان سب کو خوش اسلوبی سے برتنا اور اس کا نتیجہ کیا ہے؟ روحانی خوشی اور جسمانی خوبی، اور اصلی تمکین اور حقیقی وقار اور خود اپنی عزت کی عزت اور در حقیقت یہی پچھلی ایک بات ہے جس سے وحشیانہ پن اور انسانیت میں تمیز ہوتی ہے۔

اس تہذیب کے حاصل کرنے کے بقول مسٹر ایچ۔ ٹی۔ بکل صاحب چار اصول ہیں۔

اول جو چیزیں ہم کو دکھائی دیتی ہیں، اور جن کا سبب ہم کو معلوم نہیں ہوتا ان کے سببوں اور قاعدوں کو دریافت کرنا، اور ان کے علوم کو پھیلانا، پس جس قدر کامیابی اس میں ہوگی اسی قدر انسان کی ترقی ہوگی۔

دوم اس تحقیقات سے پہلے تجسس کا خیال پیدا ہونا چاہئے جس سے ابتدا میں تحقیقات کو مدد ملتی ہے، اور بعد کو تحقیقات سے اس کی استعانت ہوتی ہے۔

سوم، جو باتیں اس طرح پر دریافت ہوتی ہیں، وہ عقلی باتوں کے اثر کو زیادہ کرتی ہیں، اور اخلاق کی باتوں کو کسی قدر کم، مگر اخلاق کی باتیں بہ نسبت عقل کی باتوں کے زیادہ مستقل ہیں، اور ان میں کمی بیشی بہت کم ہوتی ہے۔

چہارم، اس تحریک کا بڑا دشمن، جو درحقیقت سولزیشن کا بھی سخت دشمن ہے یہ خیال ہے کہ جب تک زندگی کے امورات کی نگرانی ہر طرح پر سلطنت اور مذہب سے نہ ہو، تب تک انسان کے گروہ کی ترقی نہیں ہو سکتی، یعنی سلطنت رعایا کو یہ سکھلاوے کہ ان کو کیا کرنا چاہیے۔ اور مذہب یہ سکھلاوے کہ کس بات پر یقین کرنا چاہیے۔

پچھلی بات میں میں مسٹر بکل سے مجھ کو کسی قدر اختلاف ہے اس میں کچھ شبہ نہیں کہ لوگوں کا یہ خیال کہ گورنمنٹ ہم کو بتادے کہ ہم کو کیا کرنا چاہیے انسان کی ترقی اور تہذیب کا نہایت قوی مانع ہے اور جس قدر کہ ہندوستان میں بلکہ تمام ایشیا میں ناشائستگی اور ناتہذیبی ہے اس کا بڑا سبب یہی خیال ہے اور ہندوستان کے مسلمانوں کو اسی خیال نے غارت اور برباد کیا ہی پس جب تک یہ خیال نہ جاوے گا اور یہ خیال نہ آوے گا کہ ہم خود سوچیں کہ ہم کو اپنے لیے کیا کرنا چاہیے، اس وقت تک ہندوستان کے مسلمانوں کو نہ دولت ہوگی نہ حشمت، نہ عزت ہوگی نہ منزلت اور نہ تہذیب ہوگی اور نہ شائستگی

دوسرا جملہ جو مذہب سے متعلق ہے کسی قدر صحیح ہے اور کسی قدر غلط، یعنی غلط مذہب بلاشبہ تہذیب کا بڑا مانع ہے۔ اور اگر سچے مذہب میں غلط خیالات اور بے جا تعصبات اور مسائل اجتہادیہ اور عقائد قیاسیہ اس طرح پر مل جاویں کہ عملاً اور اعتقاداً اصلی احکام مذہبی میں اور ان میں کچھ تفرقہ اور تمیز نہ رہے تو بلاشبہ وہ بھی انسان کی ترقی اور تہذیب کا مثل مذہب غلط کے، مانع قوی ہے، الا سچا مذہب، جیسا کہ ٹھیٹ مذہب اسلام ہے۔ وہ بھی خارج ترقی انسان نہیں ہو سکتا، کیونکہ اس مذہب کے احکام اور تہذیب شائستگی کے کام دونوں متحد ہوتے ہیں۔ والسلام علی من اتبع الھدیٰ ط

۱۶۔ قومی اتفاق

مندرجہ ذیل مقالہ ان دنوں تہذیب الاخلاق بند ہونے کے باعث درج نہیں ہو سکا تھا مگر افادات سرسید کا جزو لا ینفک اور ان کے مشن کا سدرۃ المنتہیٰ ہے۔ (مرتّب)

قوم کا لفظ ایک ایسا لفظ ہے جس کے معنوں پر کسی قدر غور کرنی لازم ہے۔ زمانۂ دراز سے جس کی ابتدا تاریخی زمانہ سے بھی بالاتر ہے، قوموں کا شمار کسی بزرگ کی نسل میں ہونے یا کسی ملک کا باشندہ ہونے سے ہوتا ہے۔

محمد رسول اللہ صلعم بانی اُمّت داعی نے اس تفرقۂ قومی کو جو صرف دنیاوی اعتبار سے تھا مٹا دیا اور ایک روحانی رشتہ قومی قائم کیا جو ایک حبل المتین:

لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ

سے مضبوط تھا۔ تمام قومی سلسلے، تمام قومی رشتے، سب کے سب اس روحانی رشتے کے سامنے نیست و نابود ہو گئے، اور ایک نیا روحانی بلکہ خدائی قومی رشتہ قائم ہو گیا۔ اسلام کسی سے نہیں پوچھتا کہ وہ ترک ہے یا تاجیک؟ وہ افریقہ کا رہنے والا ہے یا عرب کا، وہ چین کا باشندہ ہے یا ماچین کا؟ وہ پنجاب میں پیدا ہوا ہے یا ہندوستان میں؟ وہ کالے رنگ کا ہے یا گورے رنگ کا؟ بلکہ جس کسی نے عروۃ الوثقیٰ کلمۂ توحید کو مستحکم پکڑا وہ ایک قوم ہو گیا! بلکہ ایک روحانی باپ کا بیٹا! کیونکہ خدا نے خود فرمایا ہے

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَۃٌ فَاَصْلِحُوْا بَیْنَ اَخَوَیْکُمْ وَاتَّقُوا اللّٰہَ لَعَلَّکُمْ تُرْحَمُوْنَ ط

کون شخص ہے جو دو بھائیوں کو ایک باپ کا بیٹا نہیں جانتا! پھر جبکہ خود خدا نے

تمام مسلمانوں کو ایک دوسرے کا بھائی فرمایا ہے تو ہم سب کا ایک روحانی باپ کی
اولاد ہونے میں کیا شک رہا ہے؟

مجھے اس بات کے دیکھنے سے نہایت افسوس ہے کہ ہم سب آپس میں بھائی تو ہیں
مگر مثل برادران یوسفؑ کے ہیں۔ آپس میں دوستی اور محبت، یکدلی اور یکجہتی بہت کم ہے۔
حسد، بغض و عداوت کا ہر جگہ اثر پایا جاتا ہے جس کا نتیجہ آپس کی نااتفاقی ہے شیطان
جس نے خدا سے وعدہ کیا کہ لاقعدن لھم صراطک المستقیم ایک مقدس
اور بظاہر نہایت نورانی حیلے سے آپس میں بھائیوں کے جن کو کہ خدا نے بھائی بنایا ہے
نفاق ڈالنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ اور جس طرح کہ ہمارے باپ حضرت آدمؑ اس کے
دھوکے کو خالص دوستی سمجھ کر دھوکے میں آ گئے۔ اسی طرح ہم بھی اس کے دھوکے
میں آ جاتے ہیں۔ اور اس نفاق کو جو ہر حالت میں مردود ہے، ایک مقدس لباس
پہناتے ہیں۔ یعنی مذہبی مقدس لباس کا خلعت اسے عنایت کرتے ہیں،

کون شخص ہے جو اس بات کو نہیں جانتا ہے۔

من قال لا اله الا الله فهو مسلم ومن استقبل قبلتنا
فهو مسلم ومن هو مسلم فهو اخ

امام اعظم رح کا مذہب مشہور ہے۔

لا نکفر احداً من اهل القبلۃ

باینہمہ فروع مسائل میں اختلاف ہونے کے سبب کس طرح ہماری قوم نے اس
حبل المتین کی بندش کو توڑا ہے، اور اس رشتہ اخوت کو جسے خود خدا نے قائم کیا تھا چھوڑا ہے۔
جس قصبہ اور شہر میں جاؤ، جس مسجد اور امام باڑے میں گزرو باہم مسلمانوں کے شیعہ و سنی،

وہابی و بدعتی، لامذہب و مقلد ہونے کی بنا پر آپس میں نفاق و عداوت پا گئے۔
ان نااتفاقیوں نے ہماری قوم کو نہایت ضعیف اور ٹکڑے ٹکڑے کر دیا ہے۔
جمعیت کی برکت ہماری قوم سے جاتی رہی ہے قومی ہمدردی اور قومی ترقی اور ترقی امور کے سرانجام میں اس نالائق نااتفاقی نے بہت کچھ اثر بد پہونچایا ہے۔ پس ہماری قومی ترقی کا سب سے اول مرحلہ یہ ہے کہ ہم سب آپس کی محبت سے اس عداوت و نفاق کو یکتائی و یک جہتی سے متبادل کریں۔
یکتائی و یک جہتی سے میرا مقصد یہ نہیں ہے کہ سب لوگ اپنے اپنے عقاید کو چھوڑ کر ایک عقیدے پر قائم ہو جاویں، یہ امر تو قانون قدرت کے برخلاف ہے، جو ہو نہیں سکتا، نہ تو پہلے کبھی ہوا، اور نہ آئندہ کبھی ہو گا۔
اتفاق کے قائم رکھنے کی جس کی ہم کو ضرورت ہے ایک اور عقلی و نقلی راہ ہے جس کی پیروی قومی اتحاد کا ذریعہ ہو سکتی ہے۔ انسان جب اپنی ہستی پر نظر ڈالے گا تو اپنے میں دو حصے پاوے گا، ایک حصہ خدا کا، اور ایک حصہ اپنے ابنائے جنس کا۔ انسان کا دل یا اس کا اعتقاد یا مختصر طور سے یوں کہو کہ اس کا مذہب خدا کا حصہ ہے جس میں دوسرا کوئی شریک نہیں، اس کے عقاید کی جو کچھ بھلائی یا برائی ہو، اس کا معاملہ اس کے خدا کے ساتھ ہے، نہ بھائی اس میں شریک ہے، نہ بیٹا، نہ دوست، نہ آشنا، اور نہ قوم۔
پس ہم کو اس بات سے جس کا اثر ہر ایک کی صرف ذات تک محدود ہے اور ہم سے کچھ تعلق نہیں ہے کچھ بھی تعلق رکھنا نہیں چاہیے۔ ہم کو کسی شخص سے اس خیال پر کہ وہ شیعہ ہے یا سنی، وہابی ہے یا بدعتی، لامذہب ہے یا مقلد یا نیچری، یا اس سے کسی بدتر لقب کے ساتھ ملقب ہے، جبکہ وہ خدا و خدا کے رسول کو برحق جانتا ہے کسی قسم

کی عداوت و مخالفت رکھنی نہیں چاہیئے، بلکہ اس کو بھی بھائی اور کلمہ کا شریک سمجھنا اور اس اخوت کو جس کو خدا نے قائم کیا ہے، قائم رکھنا چاہیئے۔

نہایت افسوس اور نادانی کی بات ہے کہ ہم کسی سے ایسے امر میں عداوت رکھیں جس کا اثر خود اسی تک محدود ہے۔ اور ہم کو اس سے کچھ بھی ضرر و نقصان نہیں، جو حصّہ کہ انسان میں اس کے ابنائے جنس کا ہے اس سے ہم کو غرض رکھنی چاہیئے۔ اور وہ حصہ آپس کی محبت، باہمی دوستی، ایک دوسرے کی اعانت، ایک دوسرے کی ہمدردی ہے۔ جس کے مجموعہ کا نام قومی ہمدردی ہے۔ یہی ایک طریقہ ہے جس سے خدا کے حکم کی بھی اطاعت اور آپس میں برادرانہ برتاؤ، قومی اتفاق، قومی ہمدردی قائم ہو سکتی ہے جو قومی ترقی کے لئے پہلی منزل ہے۔

یہ بات ہم کو بھولنی نہیں چاہیئے کہ ان روحانی بھائیوں کے سوا اور بھی ہمارے وطنی بھائی ہیں گو وہ ہمارے ساتھ اس کلمہ میں، جس نے ہم مختلف قوموں اور مختلف فرقوں کو ایک قوم اور آپس میں روحانی بھائی بنایا ہے، شریک نہیں ہیں، مگر بہت سے تمدنی امور ہیں جن میں ہم اور وہ مثل بھائیوں کے، شریک ہیں۔ ہمسایہ کا ادب ہمارے مذہب کا ایک جزو ہے، اور یہی ہمسائگی وسعت پاتے پاتے ہم ملکی اور ہم وطنی کی وسعت تک پہونچ گئی ہے۔

ان ہموطن بھائیوں میں بھی دو حصّے ہیں، ایک خدا کا اور ایک ابنائے جنس کا۔ خدا کا حصّہ خدا کے لئے چھوڑ دو اور جو حصّہ ان میں ابنائے جنس کا ہے اس سے غرض رکھو، تمام امور انسانیت میں جو تمدن و معاشرت سے تعلق رکھتے ہیں ایک دوسرے کے مددگار رہو، آپس میں سچی محبت، سچی دوستی اور دوستانہ بردباری رکھو۔

اتفاق کی خوبیاں لوگوں نے بہت کچھ بیان کی ہیں، اور وہ ایسی ظاہر ہیں کہ کوئی شخص اتفاق سے بھی ان کو مجہول نہیں سکتا۔ بہت بڑے بڑے واقعات دنیا میں گزرے ہیں جن کو پرانی تاریخیں یاد دلاتی ہیں۔ اور جن کی یاد سے ایک عجیب اثر ہمارے دلوں میں ہوتا ہے وہ سب باہمی اتفاق کا نتیجہ ہے۔ ایک ناچیز رشتہ گیاہ جو تنہا نہایت کمزور ہوتا ہے باہمی اتفاق سے ایسا قوی اور زبردست ہو جاتا ہے کہ بڑی سے بڑی قوت کا مقابلہ کرتا ہے۔ اس وقت تعلیم یافتہ دنیا میں جو کچھ ترقی ہے یا نامہذب ملکوں میں جو کچھ طاقت ہے وہ سب اتفاق کی بادولت ہے۔

بعض قابل ادب بزرگوں کا قول ہے کہ جس طرح اصلی دوستی دنیا میں نایاب ہے اسی طرح آپس کا اتفاق بھی ناممکن ہے۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ تمام انسانوں کی طبائع اور اُن کے اغراض مختلف ہیں اور جبکہ اغراض مختلف ہیں تو ضرور ہیں کہ وہ ایک دوسرے کے مخالف ہوں۔ کوئی قوم مہذب یا نامہذب ایسی نہیں پائی جائیگی جس میں باہم حسد و نفاق، عداوت اور باہمی حقارت نہ پائی جاتی ہو۔ ہاں یہ بات سچ ہے، مگر جس اتفاق پر ہم بحث کرتے ہیں وہ شخصی اتفاق نہیں ہے بلکہ قومی اتفاق ہے۔ ہمارے آپس میں مقتضائے بشریت گو کیسا ہی نفاق ہو جو خدا کے نزدیک ایک سخت گناہ ہے، مگر وہ قومی اتحاد اور قومی اتفاق کا مانع نہیں ہے۔ قومی بھلائی یا قومی بُرائی کا اثر تمام قوم کے لوگوں پر پہونچتا ہے۔ اس لئے جلب منفعت یا دفع مضرت میں سب لوگ متفق ہو جاتے ہیں اور شخصی تنازعات کا اس وقت کچھ اثر باقی نہیں رہتا ہے۔

اس زمانے میں جو سب سے بڑا سبب ہماری قوم کے تنزل کا ہے وہ یہی ہے کہ ہم میں قومی اتفاق کا خیال نیست و نابود ہو گیا ہے۔ کسی کو بجز ذاتی منفعت کے قومی

بھلائی یا قومی منفعت کا خیال بھی نہیں آتا ہے۔ اگر کوئی کچھ کرتا بھی ہے تو اس کو پہلے اپنی ذاتی غرض مدنظر ہوتی ہے اور قومی بھلائی کے پردے سے اس کی پردہ پوشی کرنی چاہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے کاموں میں برکت نہیں ہوتی۔

میں یہ نہیں کہتا کہ ہماری قوم میں نیکی کا خیال نہیں ہے۔ نہیں! ان میں بہت کچھ نیکی ہے اور بہت سے نیک کام ان سے ہوتے ہیں کیسی کیسی عالیشان مسجدیں کیسے کیسے عالیشان امام باڑے، کیسی کیسی نفیس خانقاہیں ان کی نیکی کی یادگاریں موجود ہیں۔ اب بھی ہر شہر اور قصبے میں دیکھو گے لوگ کس قدر خیر خیرات کرتے ہیں، بھوکوں کو کھلاتے ہیں، حج و زیارت میں روپیہ خرچ کرتے ہیں، مسجدیں بنواتے ہیں، کوئی ایسا کام جس میں ان کی دانست میں مذہبی نیکی ہو دل و جان سے اس میں مصروف ہوتے ہیں۔ سب لوگ قبول کریں گے کہ اس نیت سے یہ کام کیے جاتے ہیں کہ قیامت میں ان کو اس کا بدلہ ملے گا۔ اور روزِ حشر میں ان کو ثواب حاصل ہوگا۔

پھر ہم اس سے دوسرا سوال کرتے ہیں، اور کسی بزرگ کا بزرگانِ دین میں سے نام لیتے ہیں، اور پوچھتے ہیں کہ:

"تم ان بزرگ سے بھی محبت رکھتے ہو؟"

وہ ضرور جواب دیتا ہے کہ:

"ہاں کیوں نہیں؟"

تب ہم اس سے کہتے ہیں کہ:

"وہ بزرگ تو تم سے کئی سو برس پہلے گزر چکے ہیں۔ انہوں نے تم پر کوئی احسان نہیں کیا، کسی مشکل کے وقت تمہارے کام نہیں آئے۔ کبھی تنگی کے وقت میں تم کو کچھ

یہ خیال کہ ہماری رسموں میں تبدیلی کی ضرورت نہیں ہے گو وہ کیسے ہی مضبوط یقین سے دل میں بیٹھا ہو، بھروسے اور اعتماد کے لائق نہیں ہے کیونکہ ممکن ہے کہ صرف عادت نے یہ خیال ہمارے دل میں جمایا ہو۔ اس بات کا اندازہ کرنا کہ انسان جن عادتوں میں اختیار سے پرورش پاتا ہے اور پلتا ہے اور بڑھتا ہے وہ کہاں تک اس میں اثر کر جاتی ہیں، اور دوسری طبیعت سی ہو جاتی ہیں، حقیقت میں انسان کی طاقت سے بھی بہت زیادہ اور بلند درجہ پر ہے۔ چنانچہ مختلف قوموں کی مختلف رسموں پر لحاظ کرنے سے اس بات کی بخوبی تصدیق ہو جاتی ہے۔

رسومات میں اصلاح کی ضرورت خود انسان کے حالات پر غور کرنے سے ثابت ہوتی ہے۔ جبکہ ہم انسانوں کی سوسائٹیوں پر نظر ڈالتے ہیں تو ان کی رسمیں کیا مذہب کی اور کیا حکومت کی اور کیا معاشرت کی مختلف پاتے ہیں۔ مختلف کا لفظ شاید میں نے غلط کہا کیونکہ مجھ کو یوں کہنا چاہیے کہ ایک کی رسم دوسری کی رسم کے برعکس یعنی نقیض پاتے ہیں۔ اور کیونکہ دو نقیضیں کبھی صحیح نہیں ہو سکتیں اس لئے دونوں کی دونوں رسمیں بھی اچھی نہیں ہو سکتیں۔ پس رسومات متناقضہ کا موجود ہونا ہی کافی ثبوت اس بات کا ہے کہ رسومات کا توڑنا اور تبدیل کرنا اور ترقی دینا نہایت ضرور ہے۔

اس بات کے ثبوت کے لئے کہ مختلف قوموں میں تینوں قسم کی متناقض رسومات موجود ہیں۔ ان قوموں کی رسومات پر جو مذہب، حکومت اور معاشرت سے متعلق ہیں غور کرنی کافی ہے۔

دیکھو اگلے زمانہ کے یونانیوں اور مصریوں اور ہندوستان کے ہندوؤں کو جو مذہبی رسومات ہیں بیسیوں دیوتاؤں کو ماننا اور اُن کی پرستش بجالانا، اپنی نجات کا ذریعہ سمجھتے ہیں! مگر یہودی اور مسلمان: ٹھیک اس کے برخلاف ہیں وہ سمجھتے ہیں کہ سوائے ایک خدا کے کسی دوسرے کی پرستش کرنا ٹھیک جہنم میں جانا ہے۔

یہودی اور مسلمان، ہندو جگ کے وقت، اپنی نجات کے لئے قربانیاں کرتے ہیں۔ مگر ایک بودھ مذہب کا پیرو اس کو بہت بڑی ہتیا اور سخت عذاب کا کام سمجھتا ہے۔

ہندو اور رومن کیتھلک عیسائی اپنے پیشواؤں کی مورتوں کے سامنے پرستش کرنا کس قدر روحانی خوشیوں کے حاصل کرنے کا ذریعہ سمجھتے ہیں، مگر یہودی اور پروٹسٹنٹ عیسائی اور مسلمان اس کو روحانی موت کا سبب خیال کرتے ہیں۔ ایک نہایت نیک دل ہندو نہایت سچائی اور دلی اعتقاد سے اور بیکنٹھ میں جانے کے یقین سے ایک دیوتا کی مورت پر اپنی جان کی آپ قربانی کرتا ہے۔ مگر عرب کے ریگستان کا قانون بنانے والا ایسے فعل کو خودکشی قرار دیتا ہے۔ اور اس کے کرنے والے کو نرک میں ڈالتا ہے۔

ایک ہندو اپنے پیارے باپ کی لاش کو کس محبت اور عزت اور نیکی اور ابدی نجات کے یقین سے نہایت خوفناک اور تیز بھڑکتی ہوئی آگ میں جلاتا ہے۔ اور پھر اس کی چلتی ہی سے اس کی ہڈیوں کو چنتا ہے۔ اور ان کا نام "پھول" رکھتا ہے، اور پھر گنگا میں بہاتا ہے۔ مگر ایک یہودی یا عیسائی یا مسلمان اس کو

نہایت بے رحمی اور سنگدلی کا کام سمجھتا ہے۔ وہ کسی مجرم کی لاش کو بھی آگ میں ڈالنا سخت گناہ سمجھتے ہیں۔ ان کے خیال میں بھی نہیں آتا کہ کیونکر ہوسکتا ہے کہ اپنے عزیز کی لاش کو خود اپنے ہاتھوں، جلتی آگ میں ڈال دیا جائے۔ بس یہ بات غور کے قابل ہے کہ مذہبی رسومات بھی ایک قوم کی دوسری قوم سے کیسی مختلف ہیں۔

رسومات جو حکومت سے متعلق ہیں، وہ بھی باہمی اختلاف رسومات کے انداز سے مختلف ہیں۔ ایک لینڈ (امریکا) غلاموں کو آزاد کرنا گورنمنٹ کا ایسا ہی فرض سمجھتا ہے جیسا کہ دوسرا لینڈ (افریقہ کا) مالکوں کا حق غلاموں پر قائم رکھنا واجب جانتا ہے۔ ہندوستان کی پہلی حکومت میں دختر کشی ایک رسم ناقابل مزاحمت، اور ستی ایک رسم قابل ادب اور تعظیم کے تصور کی جاتی تھی، مگر موجودہ حکومت ان کو قتل انسان مستلزم سزا کا جرم قرار دیتی ہے۔

معاشرت و تمدن کی رسومات کے اختلاف کی تو کچھ انتہا ہی نہیں ہے۔ ایک قوم کو دیکھتے ہیں کہ وہ سر ننگا کرنا اور پاؤں میں جوتی پہنے رہنا نہایت تعظیم و ادب کا ادا کرنا سمجھتی ہے، مگر میں سنتا ہوں کہ ہندوؤں میں سر ڈھکے رہنا اور جوتی اتار کر ننگے پاؤں ہو جانا نہایت درجہ ادب و تعظیم کا کام سمجھا جاتا ہے۔

سب سے بڑا معاملہ معاشرت اور تمدن کا شادی و بیاہ سے متعلق ہے ایک قوم کی خوبصورت نیک لڑکی نہایت پاک مگر محبت کے بھرے ہوئے دل سے اپنے لئے آپ شوہر پسند کرتی ہے، مگر ہندوستان کی قوم کی لڑکی بیاہ کے بعد بھی اپنے شوہر سے بات تک نہیں کرتی۔

دیکھو کثرت ازدواج یعنی ایک سے زیادہ شادی کرنی ایک قوم میں
کس قدر معیوب اور کیسی قابل نفرت قرار پاتی ہے۔ مگر ہندوستان کی ایک
قوم "کولین" میں یہ رسم کیسی عمدہ اور مبارک سمجھی جاتی ہے۔ ستر برس کے
بڈھے سے سات برس کی لڑکی کی جو انہتر ۶۹ برس، جورو اس بڈھے کی ہوتی ہے

شادی کی جاتی ہے اور شادی کرنے والے اس شادی کو ایک بہت بڑا پُن اور نہایت اچھا عمدہ
کام سمجھتے ہیں اور قوم کے ہندو بھی کثرت ازدواج کو معیوب نہیں سمجھتے اور مسلمان بھی چار
تک۔ اور ان کا ایک "کولین" فرقہ بھی ہے جو کہ لا انتہا تک کثرت ازدواج کو معیوب نہیں
سمجھتا۔ مگر یورپ کی سوسائٹی میں کثرت ازدواج پر مثل ایک سنگین جرم کے سزا دی جاتی ہے

آپ زیادہ تر تعجب کریں گے جب کہ آپ اس قوم کی رسم پر غور کریں گے
جو کوہستان "سراج کلو" علاقہ کانگڑہ میں آباد ہے۔ اور جو "تبت" کہلاتی ہے
اور جن میں یہ رسم ہے کہ چار پانچ بھائیوں میں صرف ایک عورت ہوتی ہے یعنی
وہ سب ملکر ایک عورت سے شادی کرتے ہیں۔ اور وہ ان سب کی جورو ہوتی
ہے۔ جو شوہر خلوت کے مکان میں اس کے پاس جاتا ہے اپنی لاٹھی جوتی
باہر چھوڑ جاتا ہے "تاکہ دوسرا شوہر ان نشانیوں کو دیکھ کر الٹا پھر جاوے۔
اس پہاڑی ملک کو ایک وحشی ملک سمجھ کر حقیر مت سمجھو۔ اسپارٹا جیسے ملک
میں بھی ایک زمانہ میں ایسی ہی رسم تھی۔ وہاں کے مرد بغیر خاص وجہ کے
ایک سے زیادہ شادی نہ کر سکتے تھے۔ مگر وہاں کی عورتیں ایک سے زیادہ
خصم کرنے کی بلا قید مجاز تھیں۔ اور کئی کئی خصم ساتھ رکھتی تھیں۔ جس طرح ہم
لوگ ایک عورت کے کئی خصم ہونا معیوب سمجھتے ہیں اسی طرح وہ لوگ ایک

مرد کی لنگی کپڑی جو روئیں ہوناسخت معیوب اور نہایت ہی عجیب بات خیال کرتے تھے۔

ایک چینی اجن میں دانتوں کا سیاہ کرنا نہایت پیاری رسم ہے جب یورپ میں جاتا ہے تو تمام لیڈیوں کے سفید اور موتی کے سے آب دار دانت دیکھ کر نہایت متعجب ہوتا ہے۔ اور جب ان کو چلتا پھرتا دیکھتا ہے تو اور بھی تعجب میں پڑ جاتا ہے کیونکہ چینیوں میں عورتوں کے پاؤں لوہے کے شکنجے میں چڑھا کر ایسے چھوٹے چھوٹے کر دیتے ہیں کہ وہ چلنے پھرنے کے قابل نہیں رہتیں۔

اگر کوئی اشراف مسلمان خاندان کی عورت عربی گھوڑے پر سوار ہو کر سر بازار نکلے تو کون سا عیب ہے جو اس پر نہ لگایا جائے۔ مگر تمام انگلش لیڈیاں مثل مردوں کے باہر پھرتی ہیں۔ کیا آپ لوگ اس رسم کو عجیب اور نہایت ہی عجیب نہ سمجھیں گے۔ کہ میسور کی ایک قوم میں یہ رسم ہے کہ جب کسی عورت کے ہاں اول مرتبہ لڑکا پیدا ہوتا ہے۔ یا بانجھ عورت کو لڑکے کو متبنّی کرتی ہے تو اپنے ہاتھ کی دو انگلیوں کی ایک ایک پور کٹوا ڈالتی ہے اور اس کو نہایت مبارک سمجھتی ہے۔

یہ چند مثالیں بطور نمونہ کے میں نے آپ کے سامنے بیان کیں۔ ورنہ بہت سی ایسی رسمیں نکلیں گی کہ جن کو ایک قوم نہایت اچھا اور دوسری نہایت ہی بُرا سمجھتی ہوگی۔ اور چونکہ وہ دونوں رسمیں آپس میں برخلاف ہیں اس لئے وہ دونوں رسمیں اچھی نہیں ہو سکتیں۔ ان میں سے ایک اچھی ہوگی

اور ایک بُری ہوگی۔ پس اگر رسموں کی پابندی کی جائے، تو ضرور کوئی نہ کوئی قوم ایسی رسموں میں جو درحقیقت بُری اور خراب ہیں، مبتلا رہیگی۔

جو لوگ رسموں کی پابندی کے طرفدار ہیں۔ ان سے یہ سوال ہوتا ہے کہ جن رسموں کی تم پابندی چاہتے ہو، وہ رسمیں بھی تو بعد اصلاح و ترمیم و تبدیلی کے تمہارے بزرگوں نے قائم کی تھیں۔ کیونکہ تمہارے بزرگوں کے بزرگ اس سے بھی زیادہ وحشیانہ رسموں میں مبتلا تھے۔ پس جب کہ ہمارے بزرگوں نے اپنے بزرگوں کی رسموں کو اصلاح کیا ہے، تو ہم نے اپنے بزرگوں کی رسموں کو جو اصلاح کے قابل ہوں کیوں نہ اصلاح کریں؟

اگر رسموں کی اصلاح کرنا ابتدا سے انسان کی نسلوں میں جاری نہ ہوتا، اور ابتدا سے تمام انسان رسموں کی پابندی کے ایسے ہی طرفدار ہوتے جیسے کہ ٹیسی ٹس، وہ جل اگر ہے سٹم اور ولٹ، سمجھتے تھے جن کے اقوال میں نے اوپر بیان کئے، تو آپ جانتے ہیں کہ ہماری تمہاری کیا حالت ہوتی؟ ہم میں سے کسی کے آگے پیچھے کسی درخت کے روپتے بندھے ہوتے، اور کسی کے کسی جانور کے بالوں دار کچی کھال لپٹی ہوتی، اور عورتیں کے درختوں کی آڑ میں بیٹھے ہوئے خدا کے گیت گایا کرتے۔

پس جو لوگ رسموں کی اصلاح اور ترقی کے برخلاف ہیں وہ خود اس میں مبتلا ہیں جس سے لوگوں کو منع کرتے ہیں۔ کیونکہ وہ ایک ترقی یافتہ زمانہ کی رسموں کو پکڑتے ہیں، اور دوسرے ترقی یافتہ زمانہ کی رسموں کو پکڑنے سے انکار کرتے ہیں۔

تمام کام جو رسم کے برخلاف کئے جاتے ہیں ابتداً سب کو برے معلوم ہوتے ہیں۔ اس کا بڑا سبب بے علمی اور جہالت ہے۔ کیونکہ ان کی بے علمی یا ناقص تعلیم، اُن کی تعلیم کو اس قدر قوت نہیں بخشتی کہ وہ رسومات کے اس تعصب اور جہالت اور ہٹ پر جو عادتاً ان کے دل میں بیٹھی ہوئی ہے۔ غالب آوے، اور نہایت انصاف سے دیکھے کہ رسومات معینہ میں درحقیقت کیا نقص ہیں۔ اور ان کی ترقی اور اس کی اصلاح کی ضرورت ہے یا نہیں۔

رسومات کی اصلاح و ترقی: جس طرح کہ انسان کے ظاہری طریقہ زندگی کو فائدہ دیتی ہے، اسی طرح اس کی عقل کو بھی ترقی دیتی ہے ایک بات کے پیچھے لگے رہنے اور اسی لکیر پر چلے جانے سے انسان کی عقل سو جاتی ہے، اور قوت ایجاد جو خدا نے انسان میں رکھی ہے وہ معطل بلکہ قریب معدوم ہونے کے ہو جاتی ہے، اور اس سبب سے قومی تنزل شروع ہو جاتا ہے، کیونکہ قوت ایجاد ہی کے معطل ہونے سے تمام علوم و فنون میں فتور آ جاتا ہے۔ اور کسی چیز میں ترقی نہیں ہو سکتی، یہاں تک کہ جولاہے اور بڑھئی اور لوہار بھی اپنے اپنے پیشہ میں نہ کچھ ترقی کر سکتے ہیں اور نہ کچھ ایجاد کرتے ہیں، اور ٹھیک یہی حال ہندوستان کا ہو گیا ہے۔

رسومات کی اصلاح اور ترقی کے وقت بلاشبہ یہ نازک مسئلہ بحث میں آتا ہے، کہ کونسی رسم اچھی اور کونسی بری ہے۔ اور اس کا جانچنا اور تصفیہ کرنا بھی کچھ آسان کام نہیں ہے۔ بعضوں کا یہ خیال ہے کہ اگر گورنمنٹ دست اندازی

کریے تو ہم کو ان بدرسموں کو اپنی قوم سے چھڑانے کا اور سب کو دھمکا کر راہ پر لانے کا موقع ملے۔ ان کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ہم بدنامی سے محفوظ رہیں۔ اور گورنمنٹ کو لوگ بدنام کریں۔ جو لوگ اس سے زیادہ سنجیدہ اور متین اور معقول ہیں وہ ہمیشہ یہ کہتے رہتے ہیں کہ اگر برادری کا اتفاق ہو اور بزرگ بزرگ لوگ اس کو کرنے لگیں، تو یہ کام چل جاوے۔ مگر نہ کبھی کسی رسم کے چھوڑنے یا بدلنے پر اتفاق ہوتا ہے اور نہ کسی رسم میں اصلاح و ترقی ہوتی ہے۔ بلکہ اسی تاریکی کی حالت میں زمانہ گزرا چلا جاتا ہے۔

اکثروں کا یہ خیال ہے کہ آپس میں اتفاق ہو تو رسموں میں اصلاح و ترقی ہو گویا وہ اصلاح و ترقی کو اتفاق پر منحصر رکھتے ہیں۔ مگر میں اس رائے سے بالکل مختلف ہوں۔ میں سمجھتا ہوں کہ رسموں کی اصلاح و ترقی کا ذریعہ اتفاق نہیں ہے، بلکہ اختلاف ہے۔ جس شخص کے دل میں اصلاح و ترقی کرے اس میں کچھ شک نہیں کہ تمام قوم اس کو برا کہے گی اور نکو بنائے گی۔ مگر پھر رفتہ رفتہ لوگ اس کی پیروی کرنے لگیں گے اور جس طرح کہ وہ اولاً ہدف تیر ملامت ہوا تھا، انجام کو وہی سب کا ہادی اور پیشوا اور مصلح قوم شمار کیا جاوے گا۔

جب تک کوئی شخص تمام قوم سے اختلاف کر کر رسم کو نہ توڑے، وہ رسم موقوف ہی نہیں ہو سکتی۔ بس یہی ایک طریقہ اختلاف ہے جس سے قوم کی اصلاح و درستی ہو سکتی ہے، اور ایسا کرنے والا ہی سچا خیر خواہ اپنی قوم کا متصور ہے۔ پس میں اپنے عزیز ہموطنوں سے کہتا ہوں کہ چپکے چپکے اپنے فرقہ کے لوگوں میں بیٹھ کر رسموں کو برا کہنا، اور ان کی اصلاح و درستی کے لیے

ساتھیوں کو ڈھونڈھنا، اور قید سے نکلنے کے لئے قافلہ کی راہ دیکھنا محض بے فائدہ اور سراپا غلطی ہے۔ جو شخص بہادر ہے، اور اپنی قوم کا سچا خیر خواہ اس کو خود ان بھاری بیڑیوں کو توڑ کر میدان میں آنا چاہیے۔ تاکہ لوگوں کو بھی اس قید سے نکلنے کی جرأت و ہمت ہو۔

اگلے اور حال کے زمانہ میں جن لوگوں نے اپنی قوم کی بھلائی چاہی انھوں نے اسی طریقہ پر عمل کیا ہے۔ اور آج تک دنیا میں کوئی مثال ایسی نہیں ہے۔ کہ بغیر اس طریقہ کے کسی دوسرے طریقہ سے، قومی ترقی اور بد رسومات کی اصلاح ہوئی ہو۔ دیکھو اس زمانہ سے ساڑھے اڑتیس سو برس پیشتر ۳۸۵۰ "دیکھو ذبیان" میں ایک جوان تھا جس کو ابراہیم کہتے تھے، اس نے اپنی قوم کو بت پرستی میں پڑا، اور بہت سی بدرسموں میں پھنسا ہوا دیکھا۔ اس کا دل اپنی قوم کی خراب حالت پر جلا، خدا نے اس کی مدد کی، وہ اپنی قوم کے برخلاف کھڑا ہوا تمام قوم نے اس کو لعنت ملامت کی، قتل کرنا چاہا، آگ میں ڈالنا چاہا۔ مگر خدا نے اس کو بچایا، اور پھر انجام یہ ہوا کہ وہی ابراہیم تمام دنیا کی قوموں کے لئے رحمت ٹھہرا۔ صلوٰۃ اللہ علیہ و علی آلہٖ۔

پھر خدا کی اس "قربانی کی بھیڑ" کو دیکھو جس کا اسی کی قوم نے اپنی ذات نسبت میں نہایت بے رحمی اور سنگدلی سے "کالوری" پہاڑی کے نیچے بیت المقدس کے پاس خون بہایا۔ اس بیگناہ کا یہ گناہ تھا کہ اپنی قوم کی رسومات کی برائی کرتا تھا ان کو بد ذاتی اور ریاکاری سے منع کرتا تھا۔ یہ سچ ہے کہ راست بازی نے اس کو نہایت مصیبت میں ڈالا۔ مگر اس کا انجام یہ ہوا کہ کروڑوں آدمیوں نے اس

کو خدا کا اکلوتا بیٹا مانا (نعوذ باللہ منہا) اور کروڑوں آدمیوں نے اس کو "روح اللہ" اور "کلمۃ اللہ" مانا۔

دیکھو ریگستان عرب کے ہادی کو، جس نے اپنی قوم کو "لات و منات و عزیٰ" کی پرستش سے چھوڑایا، اور اولاد کے قتل سے بچایا۔ گو کہ اسی کی قوم نے اس کو ستایا، اور وطن سے نکالا، مگر انجام کو خدا کا آخری پیغمبر مانا اور اسی کی بدولت سب نے خدائے واحد کو پہچانا صلی اللہ علیہ وسلم۔

سقراط کا واقعہ بھی کچھ کم حیرت انگیز نہیں ہے۔ اس نے اپنی قوم کی بھلائی پر کمر باندھی۔ ان کی بد رسموں کی اصلاح چاہی، مگر اسی کی قوم نے اس پر دیوتاؤں کے بُرا کہنے اور ایتھنز کے نوجوان لڑکوں کے بہکانے کا الزام لگایا۔ یہاں تک کہ زہر کے پیالے سے اس کو مارا۔ مگر چند روز بھی نہیں گزرے تھے کہ تمام ایتھنز کے رہنے والوں نے اس کا ماتم کیا اور تمام دیوتاؤں سے اس کو بڑا دیوتا مانا۔

امام حجۃ الاسلام غزالی کا نام لئے بغیر میں اس فہرست کو ختم نہیں کر سکتا، جس نے اسرار مسائل اسلام کے بیان کرنے میں تا بمقدور اپنی سعی اور کوشش کی۔ اگرچہ بڑے بڑے متعصب مولویوں نے اس کے کفر کے فتوے دئے، اور اس کی کتاب احیاء علوم الدین کے جلانے کا حکم دیا، اور اس کے قتل کے عام احکام جاری ہوئے مگر انجام کار وہی غزالی امام حجۃ الاسلام کے لقب سے پکارا گیا۔

اس زمانہ میں جو واقعات گزرتے ہیں، اور جن کو اکثر لوگوں نے اپنی

آنکھ سے دیکھا ہوگا، وہ بھی یہی ہیں کہ جس شخص نے رسوماتِ بد کی اصلاح چاہی، فی الفور اس نے اپنی قوم سے مخالفت لی، اور رفتہ رفتہ لوگ اس کے ساتھی ہوتے گئے۔

بہت سے لوگوں کو تم دیکھو گے کہ ہزاروں رسموں کو فضول اور لغو سمجھتے ہیں۔ اور کچھ بھی اس میں یقین نہیں رکھتے، پر کرتے ہیں۔ اور بہت سی ایسی باتیں ہیں جن کے بے نقص ہونے پر یقین کرتے ہیں، پر کرتے نہیں۔ ایسی باتوں سے کچھ قوم کی بھلائی نہیں ہوسکتی، بلکہ میری سمجھ میں یہ بھی ایک قسم کی دغابازی ہے۔

میری نصیحت تم کو یہ ہے کہ:

وہ کرو اس کو جس پر تم کو دلی یقین ہے، اور مت کرو اس کو جس پر تم کو دلی یقین نہیں"۔

یہی اصلی سچائی ہے اور یہی ایک بات ہے جس پر دونوں جہاں کی نیکی منحصر ہے۔

خدا تمہارے نیک کاموں میں تمہاری مدد کرے!

جو لوگ کہ حسنِ معاشرت، اور تہذیبِ اخلاق، و شائستگیٔ عادات پر بحث کرتے ہیں۔ ان کے لئے کسی ملک یا قوم کے کسی رسم و رواج کو اچھا اور کسی کو بُرا ٹھہرانا نہایت مشکل کام ہے ہر ایک قوم اپنے ملک کے رسم و رواج کو پسند کرتی ہے۔ اور اسی میں خوش رہتی ہے۔ کیونکہ جن باتوں کی بچپن سے

عادت و مو انست ہو جاتی ہے، وہی دل کو بھلی معلوم ہوتی ہیں لیکن اگر ہم اسی پر اکتفا کریں۔ تو اس کے معنی یہ ہو جاویں گے کہ بھلائی اور برائی حقیقت میں کوئی چیز نہیں ہے، بلکہ صرف عادت پر موقوف ہے۔ جس چیز کا رواج ہو گیا، عادت پڑ گئی وہی اچھی ہے، اور جس کا رواج نہ ہوا اور عادت نہ پڑی، وہی بری ہے۔

مگر یہ بات صحیح نہیں۔ بھلائی اور برائی فی نفسہ مستقل چیز ہے۔ رسم و رواج سے البتہ یہ بات ضرور ہوتی ہے کہ کوئی اس کے کرنے پر نام نہیں دھرتا۔ عیب نہیں لگاتا کیونکہ سب کے سب اس کو کرتے ہیں۔ مگر ایسا کرنے سے وہ چیز اگر فی نفسہ بری ہے تو اچھی نہیں ہو جاتی۔ پس ہم کو صرف اپنے ملک یا اپنی قوم کی رسومات کے اچھے ہونے پر بھروسا کر لینا نہ چاہیئے، بلکہ نہایت آزادی اور نیک دلی سے اس کی اصلیت کا امتحان کرنا چاہیئے۔ تاکہ اگر ہم میں کوئی ایسی بات ہو، جو حقیقت میں بد ہو، اور بسبب رسم و رواج کے ہم کو اس کی بدی خیال میں نہ آتی ہو۔ تو معلوم ہو جاوے اور وہ بدی ہمارے ملک یا قوم سے جاتی رہے۔

البتہ یہ کہنا درست ہو گا کہ ہر گاہ معیوب اور غیر معیوب ہونا کسی بات کا زیادہ تر اس کے رواج و عدم رواج پر منحصر ہو گیا ہے، تو ہم کسی طرح کسی امر کے رسم و رواج کو اچھا یا برا قرار دے سکیں گے۔ بلاشبہ یہ بات کسی قدر مشکل ہے۔ مگر جبکہ یہ تسلیم کر لیا جاوے کہ بھلائی یا برائی فی نفسہ بھی کوئی چیز ہے، تو ضرور ہر بات کی فی الحقیقت بھلائی یا برائی قرار دینے کے لئے کوئی نہ کوئی

طریقہ ہوگا۔ پس ہم کو اس طریقہ کی تلاش کرنے اور اسی کے مطابق اپنی رسوم و عادات کی بھلائی یا برائی قرار دینے کی پیروی کرنی چاہیئے۔

سب سے مقدم اور سب سے ضروری امر اس کام کے لئے یہ ہے کہ ہم اپنے دل کو تعصبات سے اور ان تاریک خیالوں سے جو انسان کو سچی بات کے سننے اور کرنے سے روکتے ہیں، خالی کریں، اور اس دلی نیکی سے جو خدا تعالیٰ نے انسان کے دل میں رکھی ہے، ہر ایک بات کی بھلائی یا برائی دریافت کرنے پر متوجّہ ہوں۔

یہ بات ہم کو اپنی قوم اور اپنے ملک، اور دوسری قوم اور دوسرے ملک، دونوں کے رسم و رواج کے ساتھ برتنی چاہیئے، تاکہ جو رسم و عادات ہم میں بھلی ہے اس پر مستحکم رہیں، اور جو ہم میں بری ہے اس کے چھوڑنے پر کوشش کریں۔ اور جو رسم و عادات دوسری قوموں میں اچھی ہے اس کو بلا تعصب اختیار کریں۔ اور جو ان میں بری ہے اس کے اختیار کرنے سے بچتے رہیں۔ جب کہ ہم غور کرتے ہیں کہ تمام دنیا کی قوموں میں جو رسم و عادات مروج ہیں، انہوں نے کس طرح ان قوموں میں رواج پایا ہے۔ تو باوجود مختلف ہونے ان رسومات و عادات کے، ان کا مبدء و منشا متحد معلوم ہوتا ہے۔

کچھ شبہ نہیں ہے کہ جو عادتیں اور رسمیں قوموں میں مروج ہیں، ان کا رواج یا تو ملک کی آب و ہوا کی خاصیت سے ہوا ہے، یا ان اتفاقیہ امور سے جن کی ضرورت وقتاً فوقتاً بضرورت تمدن و معاشرت کے پیش

آتی گئی ہے۔ یا دوسری قوم کی تقلید و اختلاط سے مروج ہو گئی ہیں۔ یا انسان کی حالت ترقی یا تنزل نے اس کو پیدا کر دیا ہے۔ پس ظاہرا یہی چار سبب ہر ایک قوم اور ہر ایک ملک میں رسوم و عادات کے مروج ہونے کا مبدء و منشا معلوم ہوتے ہیں۔

جو رسوم و عادات بمقتضائے آب و ہوا کسی ملک میں رائج ہوئی ہیں ان کے صحیح اور درست ہونے میں کچھ شبہ نہیں کیونکہ وہ عادتیں قدرت اور فطرت نے ان کو سکھلائی ہیں جس کے سچ ہونے میں کچھ شبہ نہیں مگر صرف ان کے برتاؤ کا طریقہ غور طلب باقی رہتا ہے مثلاً ہم یہ بات دیکھتے ہیں کہ کشمیر میں اور لنڈن میں سردی کے سبب انسان کو آگ سے گرم ہونے کی ضرورت ہے۔ پس آگ کا استعمال ایک نہایت سچی اور صحیح عادت دونوں ملکوں کی قوموں میں ہے۔ مگر اب ہم کو یہ دیکھنا ہے کہ آگ سے استعمال کے لئے یہ بات بہتر ہے کہ مکانات میں ہندی قواعد سے آتش خانہ بنا کر آگ کی گرمی سے فائدہ اٹھاویں، یا مٹی کی کانگڑیوں میں آگ جلا کر گردن میں لٹکائے پھریں جس سے گورا گورا پیٹ اور سینہ کالا اور بھونڈا ہو جاوے۔

طریق تمدن و معاشرت روز بروز انسان میں ترقی پاتا جاتا ہے" اور اس لئے ضرور ہے کہ ہماری رسمیں و عادتیں، جو بضرورت تمدن و معاشرت مروج ہوئی تھیں" اُن میں بھی روز بروز ترقی ہوتی جاوے۔ اور اگر ہم اپنی پہلی ہی رسموں اور عادتوں کے پابند رہیں، اور کچھ ترقی نہ کریں، تو بلاشبہ بمقابل اُن قوموں کے جنہوں نے ترقی کی ہے، ہم ذلیل اور خوار

ہوں گے! اور مثل جانوروں کے خیال کیے جاویں گے، پھر خواہ ہم اس نام سے برا مانیں یا نہ مانیں۔

انصاف کا مقام ہے کہ جب ہم اپنے سے کمتر اور ناتربیت یافتہ قوموں کو ذلیل و حقیر مثل جانوروں کے خیال کرتے ہیں تو جو قومیں کہ ہم سے زیادہ شائستہ اور تربیت یافتہ ہیں۔ اگر وہ بھی ہم کو اسی طرح حقیر اور ذلیل مثل جانوروں کے سمجھیں، تو ہم کو کیا مقام شکایت ہے؟ ہاں! اگر ہم کو غیرت ہے، تو ہم کو اس حالت سے نکلنا اور اپنی قوم کو نکالنا چاہیے۔

دوسری قوموں کی رسومات کا اختیار کرنا اگرچہ بے تعصبی اور دانائی کی دلیل ہے، مگر جب وہ رسمیں اندھے پنے سے صرف تقلیداً بغیر سمجھے بوجھے اختیار کی جاتی ہیں تو کافی ثبوت نادانی اور حماقت کا ہوتی ہیں۔ دوسری قوموں کی رسومات اختیار کرنے اگر ہم دانائی اور ہوشیاری سے کام کریں، تو اس قوم سے زیادہ فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ اس لیے کہ ہم کو اس رسم سے موانست نہیں ہوتی۔ اور اس سبب سے اس کی حقیقی بھلائی یا برائی پر غور کرنے کا بشرطیکہ ہم تعصب کو کام میں نہ لاویں، بہت اچھا موقع ملتا ہے۔ اس قوم کے حالات دیکھنے سے جس میں وہ رسم جاری ہے ہم کو بہت عمدہ مثالیں سیکڑوں برس کے تجربہ کی ملتی ہیں، جو اس رسم کے اچھے یا برے ہونے کا قطعی تصفیہ کر دیتی ہیں۔

مگر یہ بات اکثر جگہ موجود ہے کہ ایک قوم کی رسمیں دوسری قوم میں بسبب اختلاط اور ملاپ کے اور بغیر قصد و ارادے کے اور ان کی بھلائی اور برائی

پر غور و فکر کرنے کے بغیر داخل ہوگئی ہیں۔ جیسے کہ ہندوستان کے مسلمانوں کا بالتخصیص حال ہے کہ تمام معاملات زندگی، بلکہ بعض امورات مذہبی میں بھی، ہزاروں رسمیں غیر قوموں کی بلا غور و فکر اختیار کر لی ہیں۔ یا کوئی نئی رسم مشابہ اس قوم کی رسم کے ایجاد کر لی ہے۔

جب ہم چاہتے ہیں کہ ہم اپنے طریق معاشرت اور تمدن کو اعلیٰ درجہ کی تہذیب پر پہونچا دیں "تاکہ جو قومیں ہم سے زیادہ مہذب ہیں وہ ہم کو بنظر حقارت نہ دیکھیں۔ تو ہمارا فرض ہے کہ ہم اپنی تمام رسوم و عادات کو بنظر تحقیق دیکھیں اور جو بری ہوں ان کو چھوڑیں اور جو قابل اصلاح ہوں ان میں اصلاح کریں۔

جو رسومات کو بسبب حالت ترقی یا تنزل کسی قوم کے پیدا ہوتی ہیں وہ رسمیں ٹھیک ٹھیک اس قوم کی ترقی اور تنزل یا عزت اور ذلت کی نشانی ہوتی ہیں۔ اس مقام پر ہم نے لفظ ترقی یا تنزل کو نہایت وسیع معنوں میں استعمال کیا ہے۔ وہ تمام قسم کے حالات ترقی و تنزل مراد لیے ہیں۔ خواہ وہ ترقی و تنزل اخلاق سے متعلق ہو، خواہ علوم و فنون اور طریق معاشرت و تمدن سے، اور خواہ ملک و دولت و جاہ و حشمت سے۔

بلاشبہ یہ بات تسلیم کرنے کے قابل ہے کہ دنیا میں کوئی قوم ایسی نہیں نکلنے کی جس کی تمام رسمیں اور عادتیں عیب اور نقصان سے خالی ہوں۔ مگر اتنا فرق بے شک ہے کہ بعضی قوموں میں ایسی رسومات اور عادات، جو درحقیقت نفس الامر میں بری ہوں، کم ہیں اور بعضی میں زیادہ۔ اور اسی

نہیں یا کبھی تمہاری تیمار داری نہیں کی کبھی تمہاری دوا اور من علاج معالجے میں کوشش نہیں کی کبھی وہ اور تم ساتھ نہیں رہے۔ نہ کبھی ساتھ اُٹھے بیٹھے۔ نہ کبھی آپس میں ملاقات بات چیت ہوئی۔ نہ کبھی ہنسی مذاق ہوا۔ نہ کبھی باہم مزاجی موافقت ہوئی جس قسم کا تم کو شوق ہے نہ وہ اس کا نام بھی نہیں جانتے تھے۔ نہ تم نے ان کو دیکھا کہ ان کے حُسن و جمال نے تم کو فریفتہ کر لیا ہو۔ پھر کیوں تم ان سے محبت رکھتے ہو؟"

اس سوال کا وہ نہایت ناراض ہوکر اور لال منہ کر کر، غصہ بھری آواز سے جواب دیتا کہ

"میاں! وہ بزرگانِ دین تھے خدا کے ہاں اُن کا بڑا درجہ ہے

وہ دین داری میں یگانۂ زمن تھے ایمانِ کامل ان کو نصیب تھا۔

دین میں سب کے سردار تھے اس لیے اُن سے محبت رکھتے ہیں!!"

اب میں بتاتا ہوں کہ یہی پچھلی محبت، محبت من حیث الدین ہے جس کو میں حُبِ ایمانی کہتا ہوں! اور یہی محبت غیر مذہب سے رکھنی شرعاً ممنوع اور حرام بلکہ کفر ہے، اور پہلی محبت جس کو میں حُبِ انسانی کہتا ہوں شرعاً ممنوع نہیں۔ دونوں قسم کی محبت میں بالبداہت تفرقہ و تمیز موجود ہے: کہ ایک قسم کی محبت اُن اسبابِ ظاہری کے باعث تھی جو بمقتضائے فطرتِ انسانی ایک کو دوسرے کے ساتھ پیدا ہو جاتے ہیں، اور دوسری قسم کی محبت، باوجود معدوم ہونے ان تمام اسبابِ ظاہری کے من حیث الدین تھی۔ اب کون شخص ہے جو ان دونوں قسم کی محبت میں تمیز نہیں کر سکتا؟ پس جن لوگوں کا یہ خیال ہے کہ غیر مذہب والوں سے سچی دوستی اور دلی محبت کرنا ممنوع ہے یہ انکی غلطی ہے جو چیز کہ خدا تعالیٰ نے انسان کی فطرت میں بنائی ہے! وہ برحق اور بالکل سچ ہے۔ ہم کو تمام دوستوں سے، خواہ وہ کسی مذہب کے ہوں سچی دوستی اور دلی محبت رکھنی اور برتنی چاہیے، مگر وہ تمام محبت اور دوستی حُبِ انسانی کے درجہ میں ہے نہ حُبِ ایمانی کے، کیونکہ حُبِ ایمانی بلا اتحاد مذہب بلکہ بلا اتحاد مشرب ہونی غیر ممکن ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ یہی ہدایت ہم کو ہمارے سچے مذہب اسلام نے کی ہے۔

(ملخصہ سکندر دارانہ خواندہ ایم از ما بجز حکایت مہر و وفا مپرس)

۱۷- خود غرضی اور قومی ہمدردی

پہلا لفظ تو بہت پُرانا ہے، مدت سے ہم سنتے چلے آئے ہیں مگر یہ پچھلا لفظ شاید چند روز سے پیدا ہوا ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یکم شوال ۱۳۰۱ھ نبوی کے بعد اس کی پیدائش ہوئی ہے مگر ضرور ہے کہ پچھلے زمانہ میں بھی اس کی جگہ کوئی اور لفظ بولا جاتا ہوگا۔

پچھلے زمانہ پر جب ہم نگاہ کرتے ہیں تو قومی ہمدردی کی بہت سی نشانیاں پاتے ہیں، جدھر جاؤ اُدھر ہزاروں کھنڈرات مسجدوں اور پلوں اور کنوؤں اور مہمان سراؤں کے پاؤ گے۔ ہزاروں لاکھوں روپیہ لگا کر لوگوں نے قوم کے آرام کے لئے مہمان سرائیں بنوائی تھیں، مسجدیں بنوائی تھیں، کنوئیں کھدوائے تھے، پُل بنوائے تھے جن کے نشانات اب بھی پائے جاتے ہیں، سنہری مسجدیں بنوائیں جن کے بڑے بڑے برج سونے کے کام سے مغرق تھے، نرے سنگ مرمر کی مسجدیں بنوائیں جو موتی مسجدوں کے نام سے مشہور ہوئی ہیں، چینی کی کامدار سراؤں کے دروازے مسجدوں کے گنبد تیار کرائے جو آج تک اسی آب و تاب سے موجود ہیں، اُس سے بھی زیادہ کیسی بڑی بڑی عالی شان خانقاہیں تعمیر کیں۔ ان کے بنانے میں لاکھوں روپیہ خرچ کئے۔ دیہات معافی کے جاگیریں دے جن کی لاکھوں روپیہ کی آمدنی قومی ہمدردی میں صرف ہوتی تھی، ہاں مدرسہ وغیرہ بنانے کا اس قدر خیال نہ تھا مگر پھر بھی مدرسے جاری کئے تھے جب تاریخ کی

کتابوں کی بہت تلاش کرو تو معلوم ہوگا کہ فیروز شاہ کے وقت میں کوئی مدرسہ تھا اور کچھ زیادہ نشان نہیں ملتا، دلی کے پرانے کھنڈرات میں تلاش کرو تو اکبر کے عہد میں ماہم انگہ کی بنائی ہوئی مسجد اور اس کے گرد کوٹھریاں پائی جاتی ہیں، جس کو لوگ ماہم انگہ کا مدرسہ کہتے ہیں، غالباً اُس میں چند اندھے قرآن حفظ کرتے ہوں گے، نہایت مشہور اور پُر رونق شاہجہاں کے عہد میں بھی چند لداؤ کی کوٹھریاں شاید پچیس تیس ہوں جامع مسجد کے نیچے بنی ہوئی تھیں جو دار البقا کے نام سے مشہور تھیں۔ اور لوگ کہتے ہیں کہ شاہجہانی مدرسہ تھا اور غالباً جس قدر ختم ادعیہ مثل خواجگان و ختم بخاری اور ختم دلائل خیرات واسطے سلامتی شاہجہاں کے ہوتے تھے وہ سب اسی میں ہوتے تھے، اس سے زیادہ مدرسوں کے بنانے کی ضرورت نہ تھی، کیونکہ بہت سے طالب علم متفرق مسجدوں میں رہتے تھے تیل بتی اُن کے مطالعہ کے لئے ملتی تھی، نذر و نیاز مردوں کی فاتحہ سوم چہلم کے بیماروں کے صدقوں کی بہت روٹیاں مسجدوں کے طالب علموں کو مل جاتی تھیں، اس کا نمونہ ہمارے زمانہ تک بھی موجود تھا۔ فتحپوری اور پنجابی کٹرہ اور کشمیری کٹرہ کی مسجدوں اور شاہ عبد العزیز صاحب کے مدرسہ اور حضرت شاہ غلام علی صاحب کی خانقاہ میں سے بہت سے طالب علم مردوں کی روٹیاں کھانے اور فاتحہ درود پڑھنے کو ملتے تھے، اب بھی قومی ہمدردی میں کچھ کسر نہیں ہے، دیکھو اس گئے گزرے زمانہ میں بھی مسلمانوں نے کیسی ہمت کی ہے، کس قدر روپیہ خرچ کرکے جامع مسجد دہلی کی مرمت کی ہے، دلی کی پرانی

عیدگاہ کا چبوترہ بڑھایا جاتا ہے، اس کا فرش درست کیا جاتا ہی تاکہ قوم کو نماز پڑھنے میں زمین کی اونچان نیچان تکلیف نہ دے، سہارنپور میں دیکھو کئی لاکھ روپیہ خرچ کرکر جامع مسجد نئی بنائی ہے اور پرانی جامع کو چھوڑ دیا ہے۔ دیوبند میں دیکھو کیسی عالیشان مسجد بنائی جاتی ہے، اس زمانہ میں اگلے مسلمانوں سے بھی زیادہ مدرسے جاری ہوتے جاتے ہیں، دیکھو پنجاب میں کتنے مدارس اسلامیہ جاری ہوئے، دہلی میں اسلامی مدرسہ جاری ہوا، لکھنؤ میں مدرسہ ایمانیہ قائم ہوا، دیوبند کے مدرسہ کا تو کچھ پوچھنا ہی نہیں، افتخار العلماء و فخر الکملا امام اعظم عہد شیخ زماں و صاحبین دوراں مدرس و مہتمم ہیں۔ پھر سہارنپور میں انبیٹھہ میں مدارس اسلامی موجود ہیں غرضکہ بہت سی جگہ مدارس جاری ہیں پھر قومی ہمدردی کے لفظ کو نیا لفظ کہنا صحیح نہیں، ہاں شاید یہ ترکیب لفظی نئی ہو مگر اسی مضمون کا سب پہلے بھی ضرور کوئی لفظ ہوگا۔ جو ہماری یاد سے جاتا رہا ہے۔ جبکہ ہم یہ باتیں سنتے اور خیال کرتے ہیں تو دل میں خیال پیدا ہوتا ہے کہ بے شک ہم لوگوں میں قومی ہمدردی قدیم سے چلی آتی ہے۔ اور اب بھی بہت پائی جاتی ہے مگر جب زیادہ غور کرکے دیکھتے ہیں۔ تو وہ سب دھوکا ہی دھوکا پایا جاتا ہے (قطع نظر اس بحث کے کہ یہ کام قوم کو مفید ہیں اور قوم کو اُس کی ضرورت ہے یا اس سے زیادہ اور چیزوں کی ضرورت ہے) جب اُن لوگوں کے جنھوں نے یہ کام کیے اور کر رہے ہیں دل سے پوچھو تو معلوم ہوگا کہ وہ یہ تمام کام اس خیالی جوش میں کر رہے ہیں کہ ہم بڑے ثواب کے کام ہیں

مصروف ہیں۔ اور ثواب کی گٹھریاں باندھ رہے ہیں ہم مرتے ہی یہ سب
کام ہم کو بہشت میں لیجاویں گے۔ اور بہشت میں بڑے بڑے درجے
پاویں گے۔ تاج ہمارے سر پر ہوگا اور موتی کا محل جنت میں ملیگا
حوریں تصرف کو ہوں گی۔ جن کو ہمارے سوا کسی نے چھوا بھی نہ ہوگا پھر
ان کی تعداد چار پر بھی محدود نہ ہوگی، بے انتہا جتنی چاہو غلمان بھی
نہایت خوبصورت خدمت کو ملیں گے، باغ ہوگا، میوہ ہوگا، نہریں ہوں گی
شراب ہوگی، پئیں گے۔ اور چین کریں گے کہ حافظ نے غلط یہ شعر کہا تھا؎

بدہ ساقی مے باقی کہ در جنت نخواہی یافت

کنار آب رکنا باد و گلگشت مصلے را

ہم بھی نہایت ادب اور صادق دل سے کہتے ہیں کہ یہ سب کچھ ہوگا۔ خدا
ہم کو بھی نصیب کرے مگر یہ تو فرمایئے کہ یہ سب کام خود غرضی کے ہیں یا قومی
ہمدردی کے، کوئی کہے ہیں تو مانوں کہ یہ کام قومی ہمدردی کے ہیں، یہ تو
بالکل ایسے ہی کام ہیں جیسے کہ ایک رند مشرب دنیا میں اپنی عیشوں کے حاصل
کرنے کو کرتا ہے اُس میں اور اُن میں اتنا فرق ہے کہ انہوں نے نقد
کو نسیہ پر چھوڑا ہے اور دوسرے جہان میں ان عیشوں کے حاصل کرنے کی
لالچ سے یہ کام کئے ہیں، غور کرنے کی بات ہے کہ باغبانوں سے اپنے
چین کے لئے مزدوری دے کر باغ لگوانا، مزدوروں کو مزدوری دیکر
اپنے آرام کے لئے محل چنوانا، کلال کو دام دے کر اپنی عیاشی کے لئے
شراب کھچوانا، اور علاوہ اس کے روپیہ خرچ کر کر سامان عیش اور لذائذ...

جمع کرنا کیا قومی ہمدردی کی جاوے گی، نعوذ باللہ ہرگز نہیں، یہ توعین خود غرضی ہے، پھر وہ باتیں جو ثواب کے لالچ سے کی جاتی ہیں کیوں قومی ہمدردی گنی جاویں گی، اور اگر ہم سے پوچھو ثواب بھی نہیں گدھے کا کھایا کھیت ہے جس کا پاپ نہ پن۔

اسلام کا صحیح مسئلہ یہی ہے کہ اُسی کام کرنے میں ثواب ہے جس کی ضرورت ہو، دیکھو پہلے کوئی اجر ہجرت سے زیادہ نہ تھا جس کی اُس وقت بڑی ضرورت تھی، فتح مکہ کے بعد کچھ بھی نہ تھا۔ حبش اُسامہ کی تجہیز کے لئے جو چار ٹکے کا اسباب ابوبکر صدیق رضؓ نے حاضر کیا جس کی ضرورت تھی مگر اب اس کی برابری، کوہ احد کے برابر سونا بھی نہیں کرسکتا یہ سچّا اصول مذہب اسلام کا ہے۔ مگر کوئی بھی اس کی پروا نہیں کرتا۔

قوم کی حالت اور اسلام کی خدمت کیسی ہی خراب ہوتی جاوے اُس کے اسباب پر غور کرنے اور اس کے رفع کرنے کا کسی کو خیال نہیں ہے اپنے خیالات کے موافق جو اپنے ثواب اور دوسرے جہاں میں اپنے چین کرنے کے کام سمجھتے ہیں وہ کرتے ہیں، پھر کس طرح خیال ہوسکتا ہے کہ وہ قومی ہمدردی کے کام ہیں بلکہ ٹھیٹ خود غرضی ہے۔ اور امید ہے کہ وہ بھی حاصل نہ ہوگی۔

۱۸- رسم و رواج

رسم اس کام کا نام ہے، جو ہمارے بزرگوں سے ہوتا چلا آیا ہے، گو کہ اب ہم کو یہ بھی نہ معلوم رہا ہو کہ وہ کیوں ہوتا تھا۔ اور اس سے کیا فائدہ ہے؟ رواج اس کام کا نام ہے۔ جس کو سب لوگ کرتے ہوں، یا کرنے لگیں، اور اس کے کرنے کو لوگ کچھ عیب نہ سمجھیں۔ بس ہو سکتا ہے۔ کہ ایک زمانہ میں کوئی کام عیب گنا جاتا ہو۔ مگر جب وہ رواج پا جائے تو لوگوں کی آنکھ میں کچھ عیب نہ رہے۔

انگریز مصنفوں نے رسم کی تعریف زیادہ وضاحت سے بیان کی ہے وہ کہتے ہیں کہ ایک کام کا ہمیشہ بار بار کرتے رہنا، یا کسی کام پر مدتوں سے بطور قانون کے عملدرآمد چلا آنا، رسم کہلاتا ہے۔ رسم ہمیشہ ایک بن لکھا ہوا قانون ہوتا ہے، جس پر سب لوگ مدت سے اتفاق کرتے چلے آتے ہیں، اور اس لئے وہ رسم بطور ایک قانون کے سند ہو جاتی ہے۔

سر والٹر ڈیلے نے بہت عمدہ بات کہی ہے کہ رسم و رواج میں وہ فرق ہے جو سبب اور نتیجہ میں ہے، کیونکہ جب کسی کام کا رواج مدت تک رہتا ہے۔ تو وہ بطور ایک قانون کے لوگوں میں پھیل جاتا ہے، اور آخر کو یہ نتیجہ ہوتا ہے کہ وہ ایک رسم بن جاتی ہے۔

عادت میں اور رسم میں ایک نہایت باریک تفاوت ہے۔ عادت خود

ہماری طبیعت کا ایک اصول ہے، جو خود ہم میں سے پیدا ہوا ہے، اور جو بالطبع اور بے تکلف ہم کو کسی کام کے بار بار کرنے کو کہتا ہے۔ رسم ایک ایسا اصول ہے جو باہر سے ہم میں آیا ہے، جس کے سبب سے ہم کسی کام کو بار بار کرتے ہیں۔ مگر اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ایک کو دوسرے سے مدد ملتی ہے، مثلاً خیرات و زکوٰۃ دینے کی رسم سے فیاضی کی عادت ہوتی ہے۔

لفظ "رسم" کا عام قانون میں بھی آتا ہے۔ اور مقنن اس کے معنی یہ بتاتے ہیں کہ:

"رسم ایک ایسا قانون ہے، جو کبھی تحریر میں نہیں آیا، مگر مدتوں سے اور عام لوگوں کی رضامندی سے جاری ہے۔"

رسم و رواج ایک بڑا حصہ ملکی قوانین کا ہوتا ہے، اور اس کا جوہر ایک ملک اور ہر ایک عملداری میں پایا جاتا ہے، انگلستان میں جو قوانین کہ "کامن لا" کہلاتے ہیں، وہ حقیقت میں وہی بن لکھے قوانین ملکی رسم و رواج کے ہیں۔ بڑے بڑے قانون دانوں نے "کامن لا" کے یہی معنی بیان کئے ہیں کہ "انگلستان کا قدیمی رواجی قانون"۔ پس ہمارے ہندوستان میں جو رسم و رواج ہے، وہ ہمارے ملک کا "کامن لا" ہے۔

تمام مقننوں کی رائے ہے کہ "کامن لا" یعنی رواجی قانون ایسا ہو جو تحریر میں نہ آیا ہو، اور اس کے قاعدے زبانی روائتوں پر چلے آتے ہوں۔ مگر یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ "کامن لا" کے لئے کچھ تحریری کتابیں نہیں ہوتیں، بلکہ "کامن لا" پر نہایت بڑی بڑی کتابیں بہت بڑے لائق اور قابل اہل

واقف کار۔ عالموں نے لکھی ہیں۔ فرق یہ ہے کہ "کامن لا" پہلے جاری ہوتا ہے۔ اور پھیل جاتا ہے، اور اس کے بعد وہ ضبط تحریر میں آتا ہے۔ یا اس پر کتابیں لکھی جاتی ہیں، اور تحریری قانون اول تحریر میں آتا ہے، اور اس کے بعد جاری ہوتا ہے اور پھیلتا ہے۔

میری رائے ہے کہ مذہب بھی رسم و رواج پیدا ہو جانے کا ایک سبب ہوتا ہے۔ مگر جب تک کہ اس کے مسائل بطور رسم کے جاری نہ ہو جاویں، رسم و رواج سے زیادہ قوت نہیں رکھتا۔ اکثر قوموں میں، بلکہ دنیا کی کل قوموں میں، بہت سی ایسی رسمیں پائی جاویں گی، جو درحقیقت ان کے مذہب کے برخلاف ہیں۔ مگر ان رسموں نے ان کے دلوں میں ایسی مضبوط جڑ پکڑلی ہے، کہ مذہب کی نہایت زبردست اور طاقتور کل بھی اس کے اکھاڑنے سے عاجز ہو گئی ہے۔

رسم و رواج کی حکومت انسانوں کے دلوں پر نہایت قوی اور سب سے زیادہ مستحکم ہوتی ہے۔ ہر شخص غلام سے بھی زیادہ اس کی تابعداری کرتا ہے۔ آقا کو اپنے غلام پر کبھی نافرمانی کا اندیشہ ہوتا ہے، مگر رسم و رواج کو اپنے غلاموں کی نسبت نافرمانی کا کبھی اندیشہ نہیں ہوتا۔ تعجب یہ ہے کہ جاہل اور عالم، نادان اور عقلمند سب برابر اس کی غلامی کرتے ہیں، اچھا قابل اور لائق آدمی جو فلاسفی اور حکمت کے باریک باریک مسئلے حل کرتا ہے، جب ان باتوں تک پہونچتا ہے، جن کا رسم و رواج مدت سے چلا آیا ہے۔ تو تمام اپنی قابلیت اور عقل و تمیز کو بھول جاتا ہے۔

اور محض نادان شخص کی مانند اس کے آگے سر جھکا لیتا ہے کس قدر ہم کو تعجب آتا ہے۔ جبکہ ہم یہ دیکھتے کہ سقراط سا شخص، جس نے اپنی قوم کے ریفارم کرنے میں اپنی جان دی، جبکہ زہر کے پیالے کا اپنی جان پر اثر پاتا ہے، اور اپنی زندگی کو چند لمحہ سے زیادہ نہیں سمجھتا، اس وقت اپنے پیارے دوست کریٹو کو وصیت کرتا ہے کہ وہ اس کی منت کو جو اس کو دولیپی اس" دیوتا پر مرغی چڑھانے کی تھی، پوری کرے۔

اس واقعہ سے ہم سمجھ سکتے ہیں کہ رسم و رواج کا انسان کے دلوں پر اور سقراط کے سے دل پر بھی، جس کے دل کو گویا خدا نے اپنے ہاتھ سے بنایا تھا۔ کیسا کچھ قوی اثر ہوتا ہے۔ ہاں یہ بات بلاشبہ تسلیم کرنے کے لائق ہے کہ جو رسم مذہبی سند پر یا مذہبی خیال پر قائم ہوتی ہے، اس کا اثر انسانوں کے دلوں پر، بہ نسبت ان رسموں کے جو اور طرح پر قائم ہوتی ہوں بہت زیادہ سخت اور نہایت قوی ہوتا ہے۔

اس میرے بیان سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ رسم و رواج کا تعلق، مذہب اور حکومت اور معاشرت سب سے برابر ہے۔ مگر میں اس بات سے کچھ بحث نہیں کرنے کا۔ کہ جو رسمیں دنیا کی قوموں میں جاری ہیں ان میں کونسی اچھی اور کونسی بری ہیں، بلکہ میں اس بات پر بحث کروں گا کہ رسومات معینہ میں خواہ وہ مذہب سے علاقہ رکھتی ہوں یا حکومت و معاشرت سے۔ اصلاح و ترقی کی ضرورت ہے یا نہیں؟ اور اگر ہے تو وہ کیوں کر ہو سکتی ہے۔؟

جو لوگ کہ مذہبی رسومات کے پابند ہیں وہ یہ سمجھتے ہیں کہ یہی رسمیں سچائی اور انسان کی بھلائی کے لئے نہایت اعلیٰ درجہ کمال پر ہیں اور ان سے زیادہ ترقی کرنا ممکن نہیں۔ یہاں تک کہ اگر کوئی شخص ان میں ترقی یا اصلاح کرنی چاہے (گو کہ وہ اسی مذہب کی سند پر کرتا ہو جس مذہب کی وہ رسمیں ہیں۔) تو اس کو کافر اور مذہب سے خارج قرار دیں گے۔ اس کا ٹھکانا بجز جہنم کے اور کہیں نہیں بتلاویں گے۔ مگر ہماری تسلّی کو صرف یہی بات کافی نہیں ہے کیونکہ اب تک ایک نہایت ضروری بات پر خیال نہیں کیا گیا ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ ان رسومات مذہبی کا اثر ہمارے دل پر درحقیقت ان کی سچائی کا سبب ہے۔ یا ہماری عادت کا، جس کی ہم کو اپنے بچپن سے عادت پڑ گئی ہے۔

رسم جو حکومت سے متعلق ہے اس پر پابند رہنے کے لئے بڑے بڑے مشہور مقنن اور عالم طرفدار ہیں۔ ٹیسی ٹس رومی مورخ کا قول ہے کہ:

"جس سلطنت میں زیادہ قانون ہوتے ہیں، اس میں اتنی ہی زیادہ بُرائی ہوتی ہے۔"

میں سمجھتا ہوں کہ غالباً میرے ملک کے لوگوں کی بھی یہی رائے ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ ہمارا ہندوستان قانون کے بوجھ کے تلے دبتا چلا جاتا ہے، اور اسی سبب سے اس میں روز بروز پیچیدہ حالات پیدا ہوتے چلے جاتے ہیں۔ رسم و رواج کے طرفداروں کے لئے رومیوں کی حکومت ایک بہت

بڑی مثال گنی جاتی ہے۔ جن کی حکومت میں تمام کام خواہ وہ عام لوگوں سے متعلق ہوتے تھے، خواہ لوگوں کے ذاتی کاموں سے، خواہ عدالت کے فیصلوں سے، باپ دادا کی رسم پر مبنی ہوتے تھے۔ یہاں تک کہ مجرموں کو سزا دیتے وقت جس طرح کہ ہم پینل کوڈ کی دفعہ کا حوالہ دیکر سزا دیتے ہیں وہ اپنے باپ دادا کی رسم کا حوالہ دے کر سزا دیتے تھے۔ سیاسٹ رومی مورخ لکھتا ہے کہ ٹاڈ گوبئین کو جلاوطن کرنے کے حکم میں یہ لکھا گیا تھا کہ:

"ایک رسم کی تبدیلی کے سبب جلاوطن کیا گیا۔"

ودجل مصنف بھی رسم و رواج کا طرفدار ہے، اور کرے سمتھ کا قول ہے کہ:

"وہ قوم غلامی کی حالت میں ہے، جس پر قانون حکومت کرتا ہے، اور آزاد قوم وہ ہے جس پر رسم و رواج کی حکومت ہوتی ہے۔"

گولڈ سمتھ لکھتا ہے کہ:

"رسم و رواج درحقیقت اپنے باپ دادا کے حکموں کو ورثہ کے طور پر لینا ہے، جس پر خود ہی لوگ چلتے ہیں اور نہایت خوشی اور رضامندی سے ان کو مانتے ہیں، اس لئے ملکی رسم و رواج کا جاری رہنا قومی آزادی کا نشان ہے، اور چونکہ یہ رسمیں اس ملک کے معزز و قابل ادب بزرگوں سے چلی آتی ہیں اس لئے ان سے آئندہ کو بھی قومی آزادی کے محفوظ رہنے کو

بڑی مدد ملتی ہے۔ شاید یہی سبب تھا جو رومن ریپبلکن رسم و
رواج کی نہایت عزت کرتے تھے۔ اور نئے قوانین کے جاری
کرنے میں نہایت تامل کرتے تھے۔ اور اسی سبب سے ان کی
سلطنت بہت دنوں تک رہی اور تمام دنیا میں بے انتہا
نیکیوں کا نمونہ ہوئی۔ قوانین کا فائدہ ان کے ماننے اور ان پر
عمل کرنے پر منحصر ہے۔ پس رسم و رواج کے قانون ان کے
بانیوں کی عزت کے سبب از خود معزز ہوتے ہیں۔ اور تمام لوگ
ان کے بانیوں کی نیکی اور انتظام کی نقل کرنے میں ہمیشہ مشغول
رہتے ہیں۔ اسی سبب سے رومی لوگ اپنے باپ دادا کی یادگار
مذہبی طور پر کیا کرتے تھے اور مدتوں تک اسی طرح عملدرآمد
کرنے سے ان کے ہاں کی معزز اور قابل ادب رسموں کی گردن
پر نئے نئے قوانین کی موٹی موٹی اور بھاری بھاری جلدیں
سوار نہیں ہوتی تھیں۔ قومی رسموں نے بسبب اپنے پرانے
اور سیدھے سادے اور مختصر ہونے کے ایک نہایت بزرگ اور
ہمیشہ قائم رہنے والی صورت پیدا کر لی ہے۔ جس کے دلوں میں
بڑی عزت بیٹھ گئی ہے۔ مگر نئے قوانین جو بڑی بڑی جلدوں
میں لکھے جاتے ہیں۔ وہ لوگوں کو گھبرا دیتے ہیں۔ اور ہمیشہ
اول بدل ہوتے رہتے ہیں۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ آدمی ان
کو بھول جاتے ہیں اور ان کو حقیر سمجھتے ہیں۔ یہ خیال کرنے

ہیں کہ جو کام انسان کرتا ہے، اس میں ضرور بڑی بڑی غلطیاں ہوتی ہیں۔ اور اس لئے ضرور ہے کہ ان قانونوں میں بھی کچھ غلطیاں ہوں۔ اور پھر وہ غلطیاں اور نقصان جلد معلوم بھی ہو جاتے ہیں۔ اور ایک جزو میں نقصان ثابت ہونے سے تمام قوانین حقارت کے قابل ہو جاتے ہیں۔ رسومات جو قدیم سے چلی آتی ہیں۔ شاید ان میں کچھ نقصان ہوں، مگر لوگ ان نقصانوں پر کچھ لحاظ نہیں کرتے، بلکہ ان کی حمایت میں ایک دوستانہ تعصب برتتے ہیں۔ فرض کرو کہ ایک قانون نہایت انصاف سے بھرا ہوا ہے۔ اور ضروری بھی ہے اور اس کے برخلاف کوئی دلیل بھی نہیں ہے۔ تو بھی لوگ اس قانون کی عزت نہیں کرتے۔ مگر رسم و رواج کے برتنے میں وہ بالکل اندھے ہو جاتے ہیں۔ اور اس کی غلطیوں کو خود دیکھتے اور سمجھتے ہیں، اور کچھ نہیں کہتے، بلکہ یہ یقین رکھتے ہیں کہ ہمارے عقلمند اور دور اندیش باپ دادوں نے جو کچھ کیا ہے۔ وہ کچھ سمجھ کر کیا ہے۔ اور کوئی نہ کوئی اس کا سبب ہوگا! اگر اب ہم اس کا سبب نہیں جانتے۔ مگر جو فائدے کہ اس رسم کے مقرر کرنے سے تھے، اس رسم کے کرتے رہنے سے برابر ہم کو ملتے رہتے ہیں۔ گو کہ ہم نہیں جانتے کہ وہ کیا فائدے تھے اور کیوں کر ہم کو ملتے ہیں "۔

یہ وہ دلیلیں ہیں جو رسم و رواج کے طرفداروں نے نہایت مضبوط سمجھ کر پیش کی ہیں۔

یہ نہ سمجھنا کہ ان کی مخالفت کسی نے نہیں کی ہے۔ مانٹیز کیو مشہور رومی مصنف اس رائے کے بالکل برخلاف ہے۔ اس کا قول ہے کہ:

"جس قوم میں جس قدر زیادہ تحریری قانون ہوتے ہیں، وہ اتنی ہی زیادہ آزاد ہوتی ہے۔"

بعضوں کا قول ہے کہ:

"اس سے زیادہ کون ملک نفرت اور حقارت کے قابل ہے، جہاں کی حکومت صرف وہاں کے رسم و رواج کے مطابق ہوتی ہے، اور کوئی تحریری عمدہ قانون جاری نہیں ہے، اور گورنمنٹ اور اس کی رعایا کے حقوق کی کوئی حد بھی معین نہیں ہے۔"

ہم بھی رسم و رواج کی پابندی کا طرفدار نہیں ہوں۔

کوئی قوم، بلکہ کوئی خاندان، ایسا نہیں ہے جس میں درباب معاشرت ہزارہا اور عجیب عجیب رسمیں جاری نہوں، یہاں تک کہ سویلائزڈ ممالک میں بھی ہزاروں لغو رسمیں جاری ہیں۔ جبکہ انسانوں کے مزاج میں وحشت کم ہوئی۔ اور جانوروں کی طرح جنگل میں رہنے اور خانہ بدوش پڑے پھرنے اور جانوروں کے شکار سے پیٹ بھر لینے، اور انہیں کی کھال پہن لینے کے بدلے انہوں نے تمدن اختیار کیا۔ اور آپس میں مل جل کر رہنے لگے،

اور معاشرت کی حالت پیدا ہونے لگی، اسی کے ساتھ رسم و رواج نے بھی ظہور پایا۔ گویا تمدن و معاشرت، رسم و رواج پیدا ہونے کا سبب ہے، اور پچھلا پہلے کا نتیجہ ہے۔ مگر ان کے قائم ہونے کے اور بھی سبب ہوئے ہیں۔ ملک کی خاصیت، مختلف ملکوں کے لوگوں کی مختلف ضرورت، قوموں کی طبیعتوں کا اختلاف، ان کے مزوں کا تفاوت، جس کو انگریزی میں "ٹیسٹ" کہتے ہیں، ان کے اعضاء کی خصوصاً دماغ کی بناوٹ، جس سے اعلیٰ یا ادنیٰ درجہ کی طبعی خیالات پیدا ہوتے ہیں۔ اور آخیر کو علم و ہنر کی ترقی۔

رسم و رواج کا تبدیل کرنا، اور ان کو ترقی دینا انسانی سوسائٹی کیلئے ایسا ہی ضرور ہے جیسا کہ ہر انسان کو زندگی قائم رکھنے کے لئے سانس لینا، اور متغیر ہوا کو نکالنا، اور تازہ حیات بخش ہوا کو اندر کھینچنا۔ اگرچہ ہر ایک شخص سمجھتا ہے کہ ہمارے رسم و رواج میں تبدیلی کی ضرورت نہیں ہے۔ لیکن جبکہ ان سببوں پر خیال کیا جاوے جو کہ رسم و رواج کے قائم ہونے کے سبب ہیں۔ اور جن کو میں نے ابھی بیان کیا ہے تو معلوم ہوگا کہ وہ سبب ہی شاید سوائے بعض کے، ایسے ہیں جن میں ہمیشہ تغیر و تبدیلی ہوتی رہتی ہیں، اور اکثر یہ ہوتا ہے کہ وہ سبب زمانہ کے گزرنے پر ترقی پاتے جاتے ہیں۔ پس ضرور ہے کہ ان کے نتیجوں یعنی رسموں میں بھی تبدیلی اور ترقی ہو۔ یہ دعوے منطقی شکل پر اس طرح قائم ہوتا ہے کہ :

رسمیں نتیجہ ہیں زمانہ کی حالت کا، اور زمانہ کی حالت ہمیشہ قابل تغیر ہے۔ پس رسمیں بھی قابل تغیر ہیں۔

وہ سے وہ پہلی قوم پچھلی قوم سے اعلیٰ اور معزز ہے، اور بعض ایسی بھی
قومیں ہیں جنہوں نے انسان کی حالت ترقی کو نہایت اعلیٰ درجہ تک پہونچایا
ہے اور اس حالت انسانی کی ترقی نے ان کے نقصان کو چھپا لیا ہے جیسے
ایک نہایت عمدہ و نفیس شیریں دریا تھوڑے سے گدلے اور کھاری پانی
کو چھپا لیتا ہے، یا ایک نہایت لطیف شربت کا بھرا ہوا پیالہ نیبو کی کھٹی
دو بوند دل سے زیادہ تر لطیف اور خوشگوار ہو جاتا ہے اور یہی قومیں
جواب دنیا میں سویلائزڈ یعنی مہذب گنی جاتی ہیں اور درحقیقت اس
لقب کی مستحق بھی ہیں۔

میری دل سوزی اپنے ہم مذہب بھائیوں کے ہمراہ اسی وجہ
سے ہے کہ میری دانست میں ہم مسلمانوں میں بہت سی رسمیں، جو درحقیقت
نفس الامر میں بری ہیں مروج ہو گئی ہیں۔ جن میں سے ہزاروں ہمارے
پاک مذہب کے بھی خلاف ہیں اور انسانیت کے بھی مخالف ہیں۔ اور
تہذیب و تربیت و شائستگی کے بھی برعکس ہیں۔ اور اس لیے میں ضرور
سمجھتا ہوں کہ ہم سب لوگ تعصب اور ضد اور نفسانیت کو چھوڑ کر ان بری
رسموں اور بدعادتوں کو چھوڑنے پر مائل ہوں۔ اور جیسا کہ ان کا پاک
اور روشن ہزاروں حکمتوں سے بھرا ہوا مذہب ہے اس طرح اپنی رسومات
معاشرت اور تمدن کو عمدہ اور پاک صاف کریں، اور جو نقصانات اس میں ہیں گو وہ
کسی وجہ سے ہوں ان کو دور کریں
اس تحریر سے یہ نہ سمجھا جاوے کہ میں اپنے تئیں ان عادتوں سے
پاک و مبرا سمجھتا ہوں یا اپنے تئیں نمونہ عادات حسنہ جتاتا ہوں یا خود

ان امور میں مقتدا بننا چاہتا ہوں۔ حاشا وکلا! بلکہ میں بھی ایک فرد انہی افراد میں سے ہوں۔ جن کی اصلاح دلی مقصود ہے۔ بلکہ میرا مقصد صرف متوجہ کرنا اپنے بھائیوں کا اپنی اصلاح حال پر ہے۔ اور خدا سے امید ہے کہ جو لوگ اصلاح حال پر متوجہ ہوں گے سب سے اول اُن کا چیلا اُن کی پیروی کرنے والا میں ہوں گا۔ البتہ مثل مخمور کے خراب حالت میں چلا جانا، اور روز بروز بدتر درجہ کو پہونچتا جانا، اور نہ اپنی عزت کا، اور نہ قومی عزت کا خیال وپاس رکھنا۔ اور جھوٹی شیخی اور بے جا غرور میں پڑے رہنا، مجھ کو پسند نہیں ہے۔

۱۹- رسم و رواج کی پابندی کے نقصانات

کیا عمدہ قول ایک بڑے دانا کا ہے "انسان کی زندگی کا منشا یہ ہے کہ اس کے تمام قوٰی اور جذبات نہایت روشن اور شگفتہ ہوں، اور ان میں باہم نامناسبت اور تناقض نہ ہو، بلکہ سب کامل کر ایک کامل اور نہایت متناسب مجموعہ ہو" ایک اور بڑے دانا شخص کی رائے کا یہ نتیجہ ہے کہ "آزادی اور اپنی خوشی پر چلنا جہاں تک کہ دوسروں کو ضرر نہ پہونچے ہر انسان کی خوشی اور اس کا حق ہے۔"

پس جہاں کہیں معاشرت کا قاعدہ اگلی روایتوں پر یا پرانی رسم و رواج پر مبنی ہے، تو وہاں انسانوں کی خوشحالی کا ایک بڑا جزو موجود نہیں ہے، اور جو کہ خوشحالی ہر فرد بشر کی، اور نیز کل لوگوں کی ترقی کا بہت بڑا جزو ہے، تو اس ملک میں جہاں رسموں کی پابندی ہے، وہ جزو بھی نابید ہوتا ہے۔

کسی شخص کی یہ رائے نہ ہوگی کہ آدمیوں کو بجز ایک دوسرے کی تقلید کے اور کچھ مطلق نہ کرنا چاہئے، اور نہ کوئی شخص یہ کہے گا کہ آدمیوں کو اپنی اوقات بسری کے طریقے، اور اپنے کاروبار کی کارروائی میں اپنی خوشی اور اپنی رائے کے مطابق کوئی بات بھی کرنی نہ چاہئے۔ سیدھا طریقہ یہ ہے،

کہ آدمی کو اس کی جوانی میں اس طرح سے تعلیم ہونی چاہیے کہ اور لوگوں
کے تجربوں سے جو نتیجے تحقیق ہو چکے ہیں، ان کے فوائد سے مستفید ہو،
اور پھر جب اس کی عقل پختگی پر پہونچے، تو خود ان کی بھلائی اور برائی کو جانچے۔
بے سوچے اور بے سمجھے رسومات کی پابندی کرنے سے، گو وہ رسمیں
اچھی ہی کیوں نہ ہوں۔ آدمی کی اُن صفتوں کی ترقی اور شگفتگی نہیں ہوتی۔
جو خدا تعالے نے ہر آدمی کو جدا جدا عنایت کی ہیں۔ ان قوتوں کا برتاؤ
جو کسی چیز کی بھلائی برائی دریافت کرنے، اور کسی بات پر رائے دینے، اور
دو باتوں میں امتیاز کرنے، اور عقل و فہم کو تیز رکھنے، بلکہ اخلاقی باتوں کی
بھلائی اور برائی تجویز کرنے میں مستعمل ہوتی ہیں، صرف ایسی ہی صورت میں
ممکن ہے، جبکہ ہم کو ہر بات کے پسند یا ناپسند کرنے کا اختیار حاصل ہو۔
جو شخص کوئی بات رسم کی پابندی سے اختیار کرتا ہے، وہ شخص اس
بات کو پسند یا ناپسند نہیں کرتا، اور نہ ایسے شخص کو اس بات کی تمیز یا خواہش
میں کچھ تجربہ حاصل ہوتا ہے۔ اخلاقی اور عقلی قوتوں کی ترقی اس صورت میں
حاصل ہوتی ہے جبکہ وہ استعمال میں لائی جاویں۔ ان قوتوں کو اوروں کی
تقلید کرنے سے کسی بات کی مشق حاصل نہیں ہوتی۔ بلکہ ایسے شخص کے لئے
بجز ایسی قوت تقلید کے جو بندروں میں ہوتی ہے، اور کسی قوت کی حاجت نہیں
البتہ جو شخص اپنا طریقہ خود پسند کرتا ہے، وہ اپنی تمام قوتوں سے کام لیتا ہے۔
زمانہ حال پر نظر کرنے کے لئے اس کو قوت تحقیق درکار ہوتی ہے، اور انجام
کار پر غور کرنے کے لئے قوت تجویز، اور اس کا تصفیہ کرنے کو قوت استقلال اور

بھلا برا ٹھہرانے کو قوت امتیاز، اور سب باتوں کے تصفیہ کے بعد اس پر قائم رہنے کے لئے قوت استقلال، اور یہی سب کام ہیں جو انسان کے کرنے کے لائق ہیں۔

آدمی مثل ایک کل کے نہیں ہے کہ جو اس کے واسطے مقرر کر دیا ہے اسی کو انجام دیا کرے

بلکہ وہ ایک درخت ہے جو ان اندرونی قوتوں کے

جو خدا نے اس میں رکھی ہیں، اور جن کے سبب سے وہ زندہ مخلوق کہلاتا ہے ہر چہار طرف پھیلے اور بڑھے پھلے اور پھولے۔

جو امر کہ پسندیدہ اور تسلیم کے قابل ہے وہ یہ ہے کہ لوگ اپنے فہم اور اپنی عقل سے کام لیں۔ اور رسم و رواج کی پابندی بھی ایک معقول طور پر رکھیں یعنی جو عمدہ و مفید ہیں ان کو اختیار کریں، جو قابل اصلاح ہوں ان میں ترمیم کریں، اور جو بری اور خراب ہوں، ان کی پابندی چھوڑ دیں، نہ یہ کہ نادھول کی طرح یا ایک کل کی مانند ہمیشہ انہی سے بندھے رہیں۔

یہ بات خیال کی جاتی ہے کہ رسومات کی پابندی نہ کرنے سے آدمی خراب کاموں اور بری باتوں میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ مگر یہ بات صحیح نہیں ہے، اس لئے کہ انسان کی ذات میں جیسے کہ خراب کام کرنے کی قوتیں اور جذبے ہیں ویسے ہی ان کے روکنے کی بھی قوتیں اور جذبے ہیں۔ مثلاً ایمان یا نیکی جو ہر انسان کے دل میں ہے۔ پس خراب کام ہونے کا یہ باعث نہیں ہے کہ اس نے رسومات کی پابندی نہیں کی، بلکہ یہ باعث ہے کہ اس نے ایک قسم کی قوتوں اور جذبوں

کو شگفتہ اور شاداب اور قوی کیا ہے، اور دوسری قسم کی قوتوں اور جذبوں کو پژمردہ اور ضعیف۔ اگر رسومات کی پابندی نہ رکھنے کے ساتھ انسان کا ایمان ضعیف نہ ہو، یا وہ دلی نیکی جو ہر انسان کے دل میں ہے پژمردہ نہ ہو، تو بجز عمدہ اور پسندیدہ باتوں کے اور کسی بات کا ارتکاب نہ ہو۔

ہمارے زمانہ میں ہر شخص، اعلیٰ سے لے کر ادنیٰ تک، رسم و رواج کا ایسا پابند ہے جیسے کوئی شخص ایک بڑے زبردست حاکم کے نیچے اپنی زندگی بسر کرتا ہو۔ کوئی شخص یا کوئی خاندان اپنے دل سے یہ بات نہیں پوچھتا کہ ہم کو کیا کرنا چاہیئے؟ اور ہمارے مناسب اور ہماری پسند کے لائق کیا بات ہے؟ یا جو عمدہ صفتیں مجھ میں ہیں، ان کا ظہور نہایت عمدگی سے کس طرح ممکن ہے؟ اور کونسی بات ان کی ترقی اور شگفتگی کی معاون ہے؟ بلکہ وہ اپنے دل سے یہ پوچھتے ہیں کہ میری حالت اور رتبہ کے کونسی چیز مناسب ہے؟ میرے رتبہ اور مقدور کے آدمی کس رسم و رواج کے مطابق کام کرتے ہیں؟ اور کوئی اس سے بھی زیادہ بیوقوف ہوا، تو وہ اپنے دل سے اس سے بھی زیادہ بدتر سوال کرتا ہے۔ اور یوں پوچھتا ہے کہ جو لوگ مجھ سے برتر ہیں، اور رتبہ اور مقدور میں زیادہ ہیں، وہ کن رسموں کو بجا لاتے ہیں؟ تاکہ یہ شخص بھی ویسا ہی کر کر انہی کی سی شان میں شامل ہو۔

اس بات سے یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ جو لوگ اس طرح پر رسومات کو بجا لاتے ہیں وہ اپنی خواہش اور مرضی سے ان رسومات کو اور چیزوں پر ترجیح دیتے ہیں، اور ترجیح دے کر پسند کرتے ہیں۔ نہیں! بلکہ حقیقت یہ ہے کہ ان لوگوں

کو بجز ایسی بات کے جو رسمی ہوتی ہے، اور کسی بات کی خواہش کرنے کا موقع یا اتفاق نہیں ہوتا، اور اس لئے طبیعت خود متحمل اور مطیع رسموں کی ہو جاتی ہے، یہاں تک کہ جو باتیں دل کی خوشی کی کرنی ہوتی ہیں ان میں بھی اوروں کے مطابق کام کرنے کا خیال اول دل میں آتا ہے۔ غرض کہ اُن کی پسند وہی ہوتی ہے، جو بہت سے لوگوں کی ہے۔ وہ صرف ایسی باتوں کے پسند کرنے پر راغب ہوتے ہیں۔ جو عام پسند ہوں، اور مذاق اور اصلی سلیقہ جو رسم و رواج کے مطابق نہ ہو، اس سے ایسی ہی گریز کی جاتی ہے جیسے کہ جرموں سے! یہاں تک کہ اپنی خاص طبیعت کی پیروی نہ کرنے نہ کرتے، ان میں اپنی طبیعت ہی باقی نہیں رہتی کہ جس کی پیروی کریں، اور ان کی ذاتی قوتیں، بالکل پژمردہ اور بے کار رہنے کے سبب بالکلیہ ضائع ہو جاتی ہیں۔ اور جو شخص اپنی دلی خواہش کرنے، اور ذاتی خوشی اٹھانے کے قائل نہیں رہتے اور عموماً ایسی طبعزاد رائیں یا خیالات نہیں رکھتے، جو خاص ان کی اصلی خوشی سے مخصوص ہوں۔ اب غور کرنا چاہیئے کہ انسان کی ایسی حالت پسندیدہ ہو سکتی ہیں یا نہیں۔

رسومات جو مقرر ہوتی ہیں، غالباً اس زمانہ میں جبکہ وہ مقرر ہوئیں، مفید تصور کی گئی ہوں، مگر اس بات پر بھروسہ کرنا کہ درحقیقت وہ ایسی ہی ہیں محض غلطی ہے، ممکن ہے کہ جن لوگوں نے ان کو مقرر کیا، ان کی رائے میں غلطی ہو، ان کا تجربہ صحیح نہ ہو، یا ان کا تجربہ نہایت محدود اور صرف چند اشخاص سے متعلق ہو، یا اس تجربہ کا حال صحیح صحیح بیان نہ ہوا ہو،

یا وہ رسم اس وقت اور اس زمانہ میں مفید ہو۔ الّا حال کے زمانہ میں مفید نہ رہی ہو بلکہ مضر ہو۔ یا وہ رسم جن حالات پر قائم کی گئی تھی، کسی شخص کی وہ حالت نہ ہو۔ غرض رسموں کی پابندی میں مبتلا رہنا ہر طرح پر نقصان کا باعث ہے۔ اگر کوئی نقصان نہ ہو، تو یہ نقصان تو ضرور ہے کہ آدمی کی عقل اور دانش، اور جودتِ طبع اور قوتِ ایجاد باطل ہو جاتی ہے۔

یہ بات بے شک ہے کہ کسی عمدہ بات کی ایجاد کی لیاقت ہر ایک شخص کو نہیں ہوتی، بلکہ چند دانا شخصوں کو ہوتی ہے، جن کی پیروی اور سب لوگ کرتے ہیں۔ لیکن رسم کی پابندی اور اس قسم کی پیروی میں بہت بڑا فرق ہے۔ رسومات کی پابندی میں اس کی بھلائی و برائی و مفید وغیر مفید و مناسب حال و مطابق طبع ہونے یا نہ ہونے کا مطلق خیال نہیں کیا جاتا۔ اور بغیر سوچے سمجھے اس کی پابندی کی جاتی ہے۔ اور دوسری حالت میں بوجہ پسند یا نا پسند ہونے کے اور اس لئے دوسری حالت میں جو قوتیں ترقی کی انسان میں ہیں۔ وہ معدوم و مفقود نہیں ہوتیں، برالّا پہلی حالت میں معدوم و نابود ہو جاتی ہیں۔

رسم کی پابندی ہر جگہ انسان کی ترقی کی مانع و مزاحم ہے۔ چنانچہ وہ پابندی ایسی قوت طبعی کے جس کے ذریعہ سے بہ نسبت معمولی باتوں کے کوئی بہتر بات کرنے کا قصد کیا جائے برابر مخالف رہتی ہے اور انسان کی تنزل حالت کا اصلی باعث ہوتی ہے۔ اب اس رائے کا دنیا کی موجودہ تو یوں

کے حال سے مقابلہ کرو۔ تمام مشرقی یا ایشیائی ملکوں کا حال دیکھو کہ ان ملکوں میں تمام باتوں کے تصفیہ کا مدار رسم و رواج پر ہے۔ ان ملکوں میں مذہب اور استحقاق اور انصاف کے لفظوں سے رسموں کی پابندی مراد ہوتی ہے۔ پس اب دیکھ لو کہ مشرقی اور ایشیائی قوموں کا جن میں مسلمان بھی داخل ہیں، کیسا ابتر اور خراب اور ذلیل حال ہے۔

ان مشرقی یا ایشیائی قوموں میں بھی کسی زمانہ میں قوت عقل اور جودت طبع اور مادہ ایجاد ضرور موجود ہوگا۔ جس کی بدولت وہ باتیں ایجاد ہوئیں جو اب رسمیں ہیں، اس لئے کہ ان کے بزرگ ماں کے پیٹ سے تربیت یافتہ اور حسن معاشرت کے فنون سے واقف پیدا نہیں ہوئے تھے۔ بلکہ یہ سب باتیں انہوں نے اپنی محنت اور علم اور عقل اور جودت طبع سے ایجاد کی تھیں، اور انہی وجوہات سے دنیا کی نہایت بڑی اور قوی اور مشہور قوموں سے ہو گئے تھے۔ مگر اب ان کا حال دیکھو کیا ہے؟ انہی رسومات کی پابندی سے ان کا مآل یہ ہوا ہے، کہ اب وہ ایسی قوموں کے محکوم ہیں، اور ایسے لوگوں کی آنکھوں میں ذلیل ہیں، جن کے آباؤ اجداد اس وقت جنگلوں میں آوارہ پڑے پھرتے تھے، جس وقت ان قوموں کے آباؤ اجداد عالی شان محلوں میں رہتے تھے، اور بڑے بڑے عبادت خانے، اور مکانات شاہی اور شہنشاہی محل بنواتے تھے۔ اس کا سبب یہی تھا کہ اس زمانہ میں ان قوموں میں رسم کی پابندی قطعی نہ تھی، اور جو کسی قدر تھی بھی، تو اس کے ساتھ ہی آزادی اور ترقی کا جوش ان میں قائم تھا۔

تو اریخ سے ثابت ہے کہ ایک قوم کسی قدر عرصہ تک ترقی کی حالت پر رہتی ہے۔ اور اس کے بعد ترقی مسدود ہو جاتی ہے۔ مگر یہ دیکھنا چاہیے کہ یہ ترقی کب مسدود ہوتی ہے۔ یہ اسی وقت مسدود ہوتی ہے جبکہ اس قوم میں سے وہ قوت اٹھ جاتی ہے، جس کے سبب سے نئی نئی قوتیں پیدا ہوتیں ہیں۔ اور ٹھیک مسلمانوں کا اس زمانہ میں یہی حال ہے، بلکہ میں نے غلطی کی، کیونکہ ترقی مسدود ہونے کا زمانہ بھی گذر گیا، اور تنزل اور ذلت و خواری کا زمانہ بھی انتہا درجہ کو پہونچ گیا ہے۔

ممکن ہے کہ کوئی شخص یہ بات کہے کہ یورپ کی قوموں میں بھی، جو اس زمانہ میں ہر قسم کی ترقی کی حالت میں شمار ہوتی ہیں، بہت سی رسمیں ہیں، اور ان رسموں کی نہایت درجہ پر پابندی ہے، تو وہ قومیں کیوں ترقی پر ہیں؟ یہ اعتراض صحیح ہے، اور درحقیقت یورپ میں رسموں کی پابندی کا نہایت نقصان ہے اور اگر اس کی اصلاح نہ ہوتی رہے گی، جیسے کہ اب تک ہوتی رہی ہے تو ان کو بھی بدنصیبی کا دن پیش آوے گا۔ مگر یورپ میں اور مشرقی ملکوں کی پابندی رسومات میں ایک بڑا فرق ہے۔ یورپ میں رسومات کی پابندی ایک عجیب اور نئی بات ہونے کو تو مانع ہے مگر رسومات کی تبدیلی کا کوئی مانع نہیں۔ اگر کوئی شخص عمدہ رسم نکالے، اور سب لوگ پسند کریں، فی الفور پرانی رسم چھوڑ دی جاویگی، اور نئی رسم اختیار کر لی جاویگی، اور اس سبب سے ان لوگوں کے قوائے عقلی اور حالت تمیز اور قوت ایجاد ضائع نہیں ہوتی۔

تم دیکھو کہ یہ پوشاک جواب انگریزوں کی ہے، ان کے باپ دادا کی نہیں ہے، بالکل اپنی پوشاک بدل دی ہے۔ ہر درجہ کے لوگوں کا جو مختلف لباس تھا اس رسم کو چھوڑ دیا گیا ہے اور ضرور سمجھا گیا ہے کہ ہر شخص ایک سا مثل اوروں کے لباس پہنے۔ اس وقت کوئی رسم یورپ میں ایسے درجہ پر نہیں ہے کہ اگر کوئی شخص کوئی رسم اس کے برخلاف، مگر اس سے عمدہ ایجاد کرے، اور لوگ اس پر اتفاق نہ کریں، اسی وقت تبدیل نہ ہو سکے، اور اسی تبدیلی کے ساتھ ان کی ترقی بھی ہوتی جاتی ہے۔ چنانچہ نئی نئی کلیں ہمیشہ ایجاد ہوتی رہتی ہیں۔ اور تا وقتیکہ ان کی جگہ بہتر کلیں ایجاد نہ ہو جاویں، وہ بدستور رہتی ہیں۔ ملکی معاملات اور تعلیم میں، بلکہ اخلاق میں، بلکہ مذہب میں، ہمیشہ ترقی کے خواہاں ہیں۔ پس یہ تصور کرنا کہ یورپ بھی مثل ہمارے دوسری قسم کی رسموں میں مبتلا ہے، محض نادانی اور ناواقفیت کا سبب ہے۔

البتہ یورپ میں اور بالتخصیص انگریزوں میں جو بات نہایت عمدہ اور قابل تعریف اور لائق خواہش کے ہے، اور درحقیقت بغیر اس کے کوئی قوم مہذب اور تربیت یافتہ نہیں ہو سکتی، وہی بات ان کے تنزل کا باعث ہو گی، بشرطیکہ اس کی اصلاح نہ ہوتی رہے گی۔ اور وہ یہ ہے کہ تمام انگریز جو حب وطن میں نامی ہیں، اس بات پر نہایت کوشش اور جانفشانی کر رہے ہیں کہ کل قوم کے لوگ یکساں ہو جائیں، اور سب اپنے خیالات اور طریقے یکساں مسائل اور قواعد کے تحت حکومت کر دیں، اور ان کوششوں کا نتیجہ انگلستان میں روز بروز ظاہر ہوتا جاتا ہے۔ جو حالات کہ اب خاص خاص لوگوں اور فرقوں

کے پائے جاتے ہیں، اور جن کے سبب ان کی خاص خاص عادتیں قائم ہوتی ہیں، وہ اب روز بروز ایک دوسرے کے مشابہ ہوتے جاتے ہیں، انگلستان میں اس زمانہ سے پہلے مختلف درجوں کے لوگ، اور مختلف ہمسایوں کے لوگ اور مختلف پیشہ والے، گویا جدی جدی دنیا میں رہتے تھے۔ یعنی سب کا طریقہ اور عادت جدا جدا تھی۔ اب وہ سب طریقے اور عادتیں ہر ایک کی ایسی مشابہ ہو گئی ہیں کہ گویا سب کے سب ایک محلے کے رہنے والے ہیں، انگلستان میں بہ نسبت سابق کے اب بہت زیادہ رواج ہو گیا ہے کہ لوگ ایک ہی قسم کی تصنیفات پڑھتے ہیں، اور ایک ہی سی باتیں سنتے ہیں۔ اور ایک ہی سی چیزیں دیکھتے ہیں۔ اور ایک ہی سے مقاموں میں جاتے ہیں اور یکساں باتوں کی خواہش رکھتے ہیں، اور یکساں ہی چیزوں کا خوف کرتے ہیں۔ اور ایک ہی سے حقوق آزادی سب کو حاصل ہیں، اور ان حقوق اور آزادیوں کے قائم رکھنے کے ذریعہ بھی یکساں ہیں، اور یہ مشابہت اور مساوات روز بروز ترقی پاتی جاتی ہے، اور تعلیم و تربیت کی مشابہت اور مساوات سے اس کو اور زیادہ وسعت ہوتی ہے۔ تعلیم کے اثر سے تمام لوگ عام خیالات کے، اور غلبہ اور رائے کے پابند ہوتے جاتے ہیں، اور جو عام ذخیرہ حقائق اور مسائل اور رایوں کا موجود ہے، اس پر سب کو رسائی ہوتی ہے۔ آمد و رفت کے ذریعوں کی ترقی سے مختلف مقاموں کے لوگ مجتمع اور شامل ہوتے ہیں۔ اور ایک جگہ سے دوسری جگہ چلے جاتے ہیں۔ اور اس سبب سے بھی مشابہت مذکور ترقی پاتی ہے۔ کارخانوں اور تجارت کی ترقی سے آسائش اور آرام کے وسیلے اور فائدے

زیادہ شائع ہوتے ہیں، اور ہر قسم کی عالی ہمتی، بلکہ بڑی سے بڑی اولوالعزمی کے کام ایسی حالت کو پہونچ گئے ہیں کہ ہر شخص ان کے کرنے کو موجود مستعد ہوتا ہے۔ کسی خاص شخص یا گروہ پر منحصر نہیں رہا ہے، بلکہ اولوالعزمی تمام لوگوں کی خاصیت ہوتی جاتی ہے۔ اور ان سب پر آزادی اور عام رائے کا غلبہ بڑھتا جاتا ہے۔ اور یہ تمام امور ایسے ہیں جیسے انگلستان کے تمام لوگوں کی رائیں اور عادتیں اور طریق زندگی اور قواعد معاشرت اور امورات رنج و راحت یکساں ہوتے جاتے ہیں، اور بلاشبہ ملک اور قوم کے مہذب ہونے کا اور ترقی پر پہونچنے کا یہی نتیجہ ہے، اور ایسا عمدہ نتیجہ ہے کہ اس سے عمدہ نہیں ہو سکتا ہے،

مگر باوصف اس کے ہم اس نتیجہ کو، بشرطیکہ اس کی اصلاح نہ ہوتی رہے، باعث تنزل قرار دیتے ہیں۔ تو ضرور ہم کو کہنا پڑے گا کہ کیوں یہ عمدہ نتیجہ باعث تنزل ہوگا؟ سبب اس کا یہ ہے کہ "اور جب سب لوگ ایک ہی طبیعت، اور عادت اور خیال کے ہو جاتے ہیں تو ان کی طبیعتوں میں سے وہ قوتیں جو نئی باتوں کے ایجاد کرنے، اور عمدہ عمدہ خیالات کے پیدا کرنے اور قواعد حسن معاشرت کو ترقی دینے کی ہیں، زائل اور کمزور ہو جاتی ہیں اور ایک زمانہ ایسا آتا ہے کہ ترقی ٹھہر جاتی ہے، اور پھر ایسا زمانہ آتا ہے کہ تنزل شروع ہو جاتا ہے۔

اس معاملہ میں ہم کو چین کے حالات پر غور کرنے سے عبرت ہوتی ہے۔ چینی بہت لئیق آدمی ہیں، بلکہ اگر بعض باتوں پر لحاظ کیا جاوے تو عقلمند بھی

ہیں، اور اس کا سبب یہ ہے کہ ان کی خوش قسمتی سے ابتدا ہی میں ان کی قوم میں بہت اچھی اچھی رسمیں قائم ہو گئیں، اور یہ کام ان لوگوں کا تھا جو اس قوم میں نہایت دانا اور بڑے حکیم تھے۔

چین کے لوگ اس باب میں مشہور و معروف ہیں کہ جو عمدہ سے عمدہ دانش و عقل کی باتیں ان کو حاصل ہیں۔ ان کو ہر شخص کی طبیعت پر بخوبی منقش کرنے کے واسطے، اور اس بات کے لئے کہ جن شخصوں کو وہ دانشمندی کی باتیں حاصل ہیں، ان کو بڑے بڑے عہدے ملیں، نہایت عمدہ طریقے ان میں رائج ہیں، اور وہ طریقے حقیقت میں بہت ہی عمدہ ہیں۔ بے شک جن لوگوں نے اپنا ایسا دستور قائم رکھا، انہوں نے انسان کی ترقی کے اسرار کو پا لیا۔ اور اس لئے چاہیے تھا کہ وہ قوم تمام دنیا میں ہمیشہ افضل رہتی، مگر برخلاف اس کے ان کی حالت سکون پذیر ہو گئی ہے اور ہزاروں برس سے ساکن ہے، اور اگر ان کی کبھی کچھ ترقی ہو گی، تو بے شک غیر ملک کے لوگوں کی بدولت ہو گی۔ اس خرابی کا سبب یہی ہوا کہ اس تمام قوم کی حالت یکساں اور مشابہ ہو گئی، اور سب کے خیالات اور طریق معاشرت ایک سے ہو گئے۔ اور سب کے سب یکساں قواعد اور مسائل کی پابندی میں پڑ گئے، اور اس سبب سے وہ قوتیں جن سے انسان کو روز بروز ترقی ہوتی ہے۔ ان میں سے معدوم ہو گئیں،

پس جبکہ ہم مسلمان ہندوستان کے رہنے والے، جن کی رسومات بھی عمدہ اصول و قواعد پر مبنی نہیں ہیں، بلکہ کوئی رسم اتفاقیہ اور کوئی رسم

بلا خیال اور قوموں کے اختلاط سے آگئی ہے، جس میں ہزاروں نقص اور برائیاں ہیں۔ پھر ہم اُن رسموں کے پابند ہوں" اور نہ اُن کی بھلائی برائی پر غور کریں، اور نہ خود کچھ اصلاح اور درستی کی فکر میں ہوں" بلکہ اندھا دھندی سے انہی کی پیروی کرتے چلے جاویں۔ تو سمجھنا چاہیئے کہ ہمارا حال کیا ہو گیا ہے، اور آئندہ کیا ہونے والا ہے۔

ہماری نوبت چینیوں کے حال سے بھی رسومات کی پابندی کے سبب بدتر ہو گئی ہے، اور اب ہم خود اتنی طاقت نہیں رہی کہ ہم اپنی ترقی کر سکیں۔ اس لئے بجز اس کے کہ دوسری قوم ہماری ترقی اور ہمارے قوائے عقلی کی تحریک کا باعث ہیں، اور کچھ چارہ نہیں۔ بعد اس کے کہ ہمارے قوائے مغلیہ تحریک میں آجاویں۔ اور پھر قوت ایجاد ہم میں شگفتہ ہو، تب ہم پھر اس قابل ہوں گے کہ خود اپنی ترقی کے لئے کچھ کر سکیں۔

مگر جب ہم دوسری قوموں سے ازراہ تعصب نفرت رکھیں۔ اور کوئی نیا طریقہ زندگی کہ وہ کیسا ہی بے عیب ہو" اختیار کرنا صرف بسبب اپنے تعصب نفرت رکھیں اور کوئی نیا طریقہ زندگی کہ وہ کیسا ہی بے عیب ہو اختیار کرنا صرف بسبب اپنے تعصب یا رسم و رواج کی پابندی کے معیوب سمجھیں تو پھر ہم کو اپنی بھلائی اور اپنی ترقی کی کیا توقع ہے۔

۲۰- نوروز

سوا چار برس بخیریت گذر گئے۔ اب پھر نیا سال شروع ہوا۔
گذشتہ برسوں میں جو کچھ ہنگامے ہونے تھے ہو لئے۔ اب دم باقی
رہ گئی ہے۔ چاند کی بڑھیا کی کہانی ہے۔ کہ ہاتھی نکل گیا ہے۔ دم باقی
ہے۔ آج اگر ہم اپنی قسمت پر فخر کریں تو بھی بجا ہے۔ اور اگر اپنی قوم کے
اقبال کی فصل کی آمد آمد کی خوشیاں منائیں تو بھی زیبا ہے۔ جو کچھ کہ اس
سوا چار برس میں ہوا کیا ایسے قلیل زمانہ میں اس کے ہونے کی ہم کو
توقع تھی۔ توبہ توبہ! کیا ہم کو ایسا جلد ان ناچیز پرچوں سے اپنی قوم کے
جگانے اور اٹھانے کی جو مدت دراز سے غفلت کے تاریک گڑھے میں پڑی
ہوئی بے خبر سو رہی تھی توقع تھی۔ استغفر اللہ!

وہ عید کا مبارک دن یعنی یکم شوال ۱۳۸۰ نبوی اور ۱۲۸۷ ہجری
جب کہ ہمارا پہلا پرچہ نکلا۔ امید ہے کہ ہماری قوم کی تاریخ میں کبھی بھولا
نہ جاوے گا۔ ہماری قوم کی جو کچھ بد اقبالی تھی۔ وہ یہی تھی کہ کچھ نہ تھے
اور جانتے تھے کہ ہم سب کچھ ہیں۔ اس غفلت کی دارو ئے بے ہوشی نے
ان کے کانوں کو بہرا کر دیا تھا۔ ان کی آنکھوں کو بہرا دیا تھا۔ دل بے خبر ہو گئے

ا۔ تہذیب الاخلاق کی طرف اشارہ ہے۔

تھے۔ دماغ قابو میں نہیں رہا تھا۔ ہاتھ پاؤں سست ہوگئے تھے
زندہ تھے پر مردوں سے بدتر تھے۔ اٹھتے بیٹھتے چلتے پھرتے تھے
پر کچھ نہ کرتے تھے۔ اسی تھوڑے عرصہ میں وہ حالت بہت کچھ بدل گئی
کچھ لوگ بخوبی ہوشیار ہوگئے۔ وہ سمجھے کہ ہماری کیا حالت ہے اور ہم
پر کیا مصیبت ہے۔ لبوں پر جان ہے۔ پھر اگر جان نہیں تو جہاں نہیں۔
کچھ لوگ ہوشیار ہوئے۔ پر ابھی آنکھیں ملتے ہیں۔

بہت سونے اور اندھیرے میں پڑے رہنے سے آنکھوں میں چیپڑ
جا ہوا ہے۔ کچھ کھلتی ہیں مگر روشنی سے چوندھیا جاتی ہیں۔ کچھ لوگ ابھی
تک نیند کے خمار میں ہیں کچھ حرکت تو ان میں آئی ہے مگر ابھی انگڑائی لیکر
اور کروٹ بدل کر پھر غافل ہوجاتے ہیں۔ جب پھر جھنجھوڑو تو ہاں اچھا
کہہ کر دوسری کروٹ لیتے ہیں اور پھر غافل ہوجاتے ہیں۔ کچھ لوگ ایسے
ہیں کہ ابھی بدستور غافل پڑے سوتے ہیں۔ اور کچھ ایسے ہیں کہ ہوشیار
ہوئے ہیں مگر بدمزاجی اور تند خوئی سے ضد میں آکر کمل تانے پڑے ہیں۔
اور کہتے ہیں کہ ہاں ہم نہیں اٹھنے کے تمہارا کیا اجارہ ہے۔ ہم یوں ہی پڑے
رہیں گے۔ بعض ان میں سے اپنے پاس والوں کو کہتے ہیں کہ تم بھی پڑے
رہو مت اٹھو۔ سید احمد کون ہے جو جگاتا پھرتا ہے؟ ہم اسی بات
کو سنکر خوش ہوتے ہیں۔ اور دور ہی سے کھڑے کہتے ہیں کہ وہ اٹھے
وہ کلبلائے۔ خدا نے چاہا تو اب سمجھدار بھی ہوجائیں گے۔ یہی رسمت
وغیرہ ہماری قوم کے اقبال کی نشانی ہے۔ پھر بیجا تو سہی اب کسی نہ کسی

طرف بہ نکلے گا۔ لوہا پگلا تو سہی۔ اب کچھ نہ کچھ ڈھل رہے گا۔ بند پانی سے بجز سڑ جانے کے اور کچھ نہیں ہوتا۔ پانی کو بہنا چاہیئے۔ پھر کوئی نہ کوئی اپنا رستہ بنا لے گا۔ اس وقت ہماری ساری قوم میں اس بات کا غلغلہ ہے کہ ہماری حالت اچھی نہیں۔ قوم کے لئے کچھ کرنا چاہیئے۔

کیا یہ صدا ان لوگوں کے دلوں میں جو قومی بھلائی چاہنے والے ہیں جان نہیں ڈال دیتی ہے؟ سولزیشن جس کے نام سے لوگوں کو نفرت تھی کیا اب اس کا چرچا ہر گلی کوچہ میں نہیں ہے۔ کیا نیچر کا قافیہ کیچڑ کہتے ہوئے اب لوگوں کو شرم نہیں آتی ہے (معاف کیجئے ان ضدی سونے والوں کا ذکر نہیں ہے) کیا قومی ہمدردی کی کسی نہ کسی قدر تحریک اب ہر ایک کے دل میں نہیں ہے۔ کیا چار دانگ ہندوستان کے اخباروں میں تمدن تہذیب، سولزیشن، سولزیشن، قومی ہمدردی، قومی ہمدردی، پیٹریا ٹزم پیٹریا ٹزم کا غلغلہ نہیں ہے۔ کوئی اخبار اٹھاؤ اس میں۔ ان میں سے کسی نہ کسی پر کوئی نہ کوئی چھوٹا موٹا آرٹیکل دیکھ لو۔ جس گلی کوچہ میں جاؤ سید احمد کے تہذیب الاخلاق کا جھگڑا سن لو۔ مکہ میں جاؤ تو سید احمد کو پاؤ۔ مدینہ میں جاؤ تو سید احمد کو پاؤ۔ برا کہو خواہ بھلا کہو۔ مگر ہم دعا گویوں کو مت بھولو۔

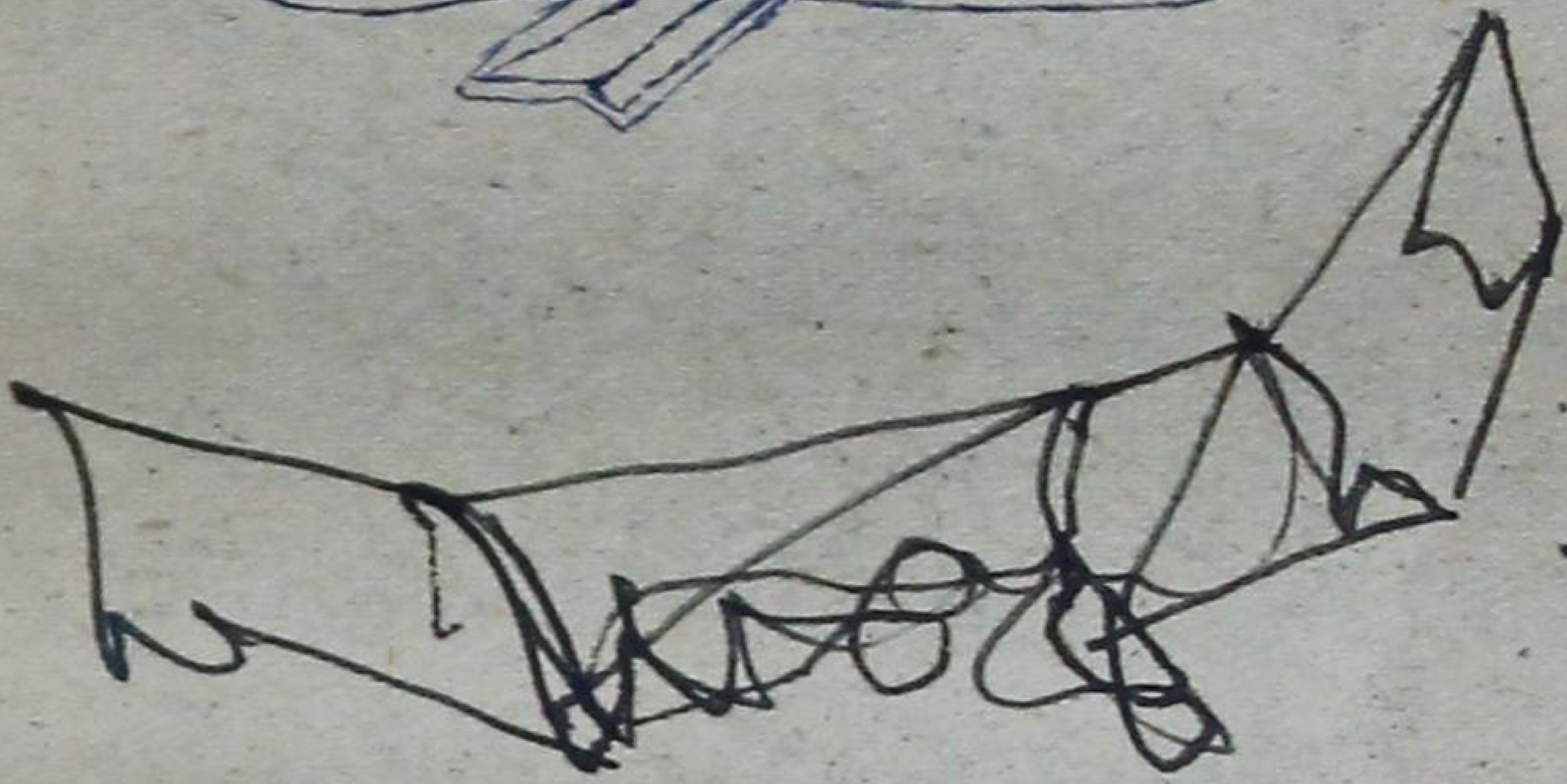
قطع کیجئے نہ تعلق ہم سے کچھ نہیں ہے تو عداوت ہی سہی (غالبؔ)

یہ ولولہ اور غلغلہ اور ہر ایک بات کا چرچا دراصل ہماری قوم کی بھلائی کی نشانی ہے۔ اس پر ہم کو ذرا بھی خیال نہیں ہے۔ کہ کسی کی کیا رائے ہے

اور کسی کی کیا۔ کیونکہ جو بات ٹھیک نہیں ہے۔ وہ آج نہیں کل نہیں
پرسوں سب کو معلوم ہو جاوے گی اور سب اسی پر یقین کریں گے۔
اور اسی پر متفق ہوں گے۔ ضرور ایک دن آوے گا جو قوم کہے گی کہ ہاں
سید احمد بھی کوئی دیوانہ تھا۔ پر بات ٹھکانے کی کہتا تھا۔ اگر ہمارا یہ
خیال صحیح ہو اور درحقیقت ہماری قوم میں ایسی تحریک آگئی ہو تو
ہمارے اس ناچیز پرچہ نے اپنا کام پورا کر لیا اور اس کی مراد پوری ہو گئی
مگر ہمارے بعد محب وطن جو دل سے اپنی قوم کی بھلائی اور قومی
ترقی چاہتے ہیں۔ کبھی غلطی میں پڑ جاتے ہیں۔ جب کبھی ان کو کسی سولائزڈ
یعنی مہذب۔ تربیت یافتہ شائستہ قوم میں سے کسی کی کوئی وحشیانہ حرکت
معلوم ہوتی ہے تو اس کو بہت طمطراق سے بیان کرتے اور لکھتے ہیں۔
اور کہتے ہیں کہ جب اس قوم میں بھی ایسی وحشیانہ حرکتیں ہوتی ہیں۔
تو ہماری قوم کو کیوں برا کہا جاتا ہے۔ مگر ان کو سمجھنا چاہئے کہ اگر ہم کسی
دوسرے کی آنکھ کی پھلی کو ٹٹولیں تو اس سے ہماری آنکھ کا ٹینٹ نہیں
چھپتا۔ ہم کو اپنی آنکھ کے ٹینٹ کا علاج کرنا چاہئے۔ دوسرے کی آنکھ
میں پھلی ہو یا نہ ہو۔ بایں ہمہ وہ لوگ اس بات میں ذرا انصاف نہ بھی نظر
نہیں کرتے۔ قوم کی محبت انصاف کو چھپا دیتی ہے۔ جس میں قوم کے
کسی شخص کی وحشیانہ حرکت کی ہم گرفت کرتے ہیں اس وقت اس بات
کو بھول جاتے ہیں کہ اس قوم میں خوبیاں کتنی ہیں۔ ہماری قوم میں
وہ عیب تو ہیں اور وہ خوبیاں کسی میں نہیں۔ اصلی محبت اور سچی خیرخواہی

قوم کی یہی ہے کہ اس کے نقصانوں کو دیکھے اور ان کے مٹانے کی فکر کرے۔ جو لوگ نہایت ہمدردی اور قومی محبت سے اپنی قوم کے عیبوں اور نقصانوں سے مطلع کرتے ہیں۔ ان کا دل اپنی قوم کی عالت پر بہ نسبت ان کے جو قوم کی طرف داری کرتے ہیں اور اس کے عیبوں کو چھپاتے ہیں۔ بہت زیادہ جلتا ہے۔ اور حقیقت میں یہی لوگ محب وطن اور محب قوم ہیں (سرسید)





۲۱۔ اُمّید

موجودہ حالت گو وہ کیسی ہی اچھی یا بُری ہو، انسان کے دل کے شغل کو کافی نہیں ہوتی۔ موجودہ رنج و خوشی، محبت و دوستی کی چیزیں اتنی نہیں ہوتیں کہ انسان کے دل کی قوتوں کو ہمیشہ مشغول رکھیں، اس لئے اس بڑے کاریگر نے جس نے انسان کے پتلے کو اپنے ہاتھ سے اور اپنی ہی مانند بنایا، اس میں چند اور قوتیں دی ہیں جن کے سبب سے دل کے لئے کاموں کی کبھی کمی نہیں ہوتی، اور ہمیشہ و ہر وقت دل کے مشغول رہنے کا سامان مہیا اور موجود رہتا ہے۔ انہیں قوتوں کے ذریعہ سے گزری ہوئی باتیں پھر دل میں آتیں اور آئندہ کی باتوں کا اُن کے ہونے سے بیشتر خیال ہوتا ہے۔

وہ عجیب قوت جس کو ہم یاد کہتے ہیں، ہمیشہ پیچھے دیکھتی رہتی ہے۔ جب کوئی موجودہ چیز ہم کو شغل کے لئے نہیں ملتی، تو وہ قوت پچھلی باتوں کو بلا لاتی ہے، اور اسی کے فکر یا خیال سے ہمارے دل کو بہلائے رکھتی ہے۔ اس کی مثال جگالی کرنے والے جانوروں کی سی ہے کہ پہلے تو گھاس دانہ سب کھا لیتے ہیں، اور جب ہو چکتا ہے، تو ایک کونے میں بیٹھ کر پھر اسی پیٹ میں سے نکال کر چبائے جاتے ہیں۔

جس طرح کہ یاد پچھلی باتوں کو خالی وقت میں ہمارے دل میں شغل کو بلا لاتی ہے، اسی طرح ایک اور قوت ہے، جو آئندہ ہونے والی باتوں کے

خیال میں دل کو مشغول کر دیتی ہے۔ جس کا نام امید، بیم یا خوف و رجا ہے۔ انہی دونوں قسم کے خیالوں سے ہم آئندہ زمانہ تک پہونچ جاتے ہیں "اور جو باتیں کہ دور زمانہ میں شاید ہونے والی ہیں از ظلمات کے پردوں میں چھپی ہوئی ہیں " اور بڑے گہرے اندھیرے گڑھوں میں پڑی ہوئی ہیں۔ ان کو ایسا سمجھتے ہیں۔ کہ ابھی ہو رہی ہیں، ان کے ہونے سے پہلے اُن کی خوشی یا رنج اُٹھانے لگتے ہیں، یہاں تک کہ اس زمانہ کا بھی، جب نہ یہ زمین ہوگی اور نہ یہ آسمان اور ہر چہار طرف سے لمن الملک الیوم کی آواز آتی ہوگی، ابھی خیال کر لیتے ہیں۔ پھر کون کہہ سکتا ہے کہ انسان کی زندگی، صرف موجودہ وقت پر محدود ہے؟

میرا ارادہ ہے کہ میں اس تحریر میں صرف اسی کا کچھ بیان کروں۔ جس کو امید کہتے ہیں۔ ہماری خوشیاں اس قدر کم اور چند روزہ ہیں کہ اگر وہ قوت ہم میں نہ ہوتی، جس سے انسان ان عمدہ اور دل خوش کن چیزوں کا ان کے ہونے سے پہلے مزہ اٹھاتا ہے جن کا کبھی ہو جانا ممکن ہے، تو ہماری زندگی نہایت ہی خراب اور بدمزہ ہوتی۔ ایک شاعر کا قول ہے کہ:

"ہم کو تمام عمدہ چیزوں کے حاصل ہونے کی امید رکھنی چاہیے کیونکہ کوئی چیز ایسی نہیں ہے جس کی امید نہ ہو سکے اور کوئی چیز ایسی نہیں ہے جو ہم کو دے نہ سکے"۔

فارسی زبان کا مشہور قول ہے کہ "تمنا را عیب نیست" ایک ظریف نے کہا کہ:

"دنیا میں مجھے کسی چیز کا رنج نہیں ہے، کیونکہ امید مجھے ہمیشہ خوش

رکھتی ہے۔"

دوستوں نے پوچھا کہ:

"کیا تم کو مرنے کا بھی رنج نہیں ہے؟"

اس نے کہا کہ:

"کیا عجب ہے کہ میں کبھی نہ مروں، کیونکہ خدا اس پر بھی قادر ہے کہ ایک ایسا شخص پیدا کرے جس کو موت نہ ہو، اور مجھکو امید ہے کہ شاید وہ شخص میں ہی ہوں۔"

یہ قول ایک ظرافت کا تھا، مگر سچ یہ ہے کہ زندگی کی امید ہی موت کا رنج ہم سے مٹاتی ہے۔ اگر ہم کو زندگی کی امید نہ ہوتی تو ہم سے زیادہ بدتر حالت کسی کی نہ ہوتی۔

زندگی ایک بے جان چیز کی مانند ہے جس میں کچھ حرکت نہیں ہوتی، امید اس میں حرکت پیدا کرتی ہے۔ امید ہی کے سبب سے انسان میں روح کی جان ہے۔ ہمیشہ روح کو خوش رکھتی ہے اور تمام تکلیفوں کو آسان کر دیتی ہے۔ محنت پر رغبت دلاتی ہے، اور انسان کو نہایت سخت اور مشکل کاموں کے کرنے پر آمادہ رکھتی ہے۔

امید سے ایک اور بھی فائدہ ہے، جو کچھ کم نہیں ہے: کہ ہم موجودہ خوشیوں کی کچھ بہت قدر نہیں کرتے، اور اسی میں محو نہیں ہو جاتے سیزر (قیصر روم) نے جب اپنا تمام مال و اسباب اپنے دوستوں کو بانٹ دیا، تو اس سے لوگوں نے پوچھا کہ:

"آپ نے اپنے لئے کیا رکھا؟"

اس نے کہا کہ:

"امید!"

اس کی عالی طبیعت ان چیزوں کی کچھ قدر نہیں کرتی تھی، جو اس کے پاس تھیں، بلکہ ہمیشہ اس کا خیال کسی بہتر چیز کی طرف رہتا تھا۔

اگلے زمانہ کے لوگ بغیر امید کی زندگی کو نہایت ہی برا سمجھتے تھے۔ نقل ہے کہ خدا نے انسان کے پاس ایک صندوقچہ بھیجا، جب اس کو کھولا تو اس میں سے ہر ایک قسم کی بلائیں اور مصیبتیں اور بیماریاں جو انسان کو ہوتی ہیں، سب نکل پڑیں، امید بھی اسی صندوقچہ میں تھی، وہ نہ نکلی بلکہ ڈھکنے میں چمٹ رہی اور صندوقچہ ہی میں بند ہو گئی، تاکہ مصیبت کے وقت انسان کو تسلی دے۔

پس اچھی زندگی میں امید ہے اس سے بڑھ کر کوئی خوش زندگی نہیں ہے، خصوصاً جبکہ امید ایک عمدہ چیز کی، اور اچھی بنا پر ہو، اور ایسی چیز کی ہو جو امید کرنے والے کو حقیقت میں خوش کر سکتی ہو، اس بات کی حقیقت وہی لوگ خوب جانتے ہیں جو سمجھتے ہیں کہ زیادہ سے زیادہ خوش حال آدمی کے لئے بھی زمانہ موجودہ میں کافی خوشی نہیں ہے۔

میں یہ بھی سمجھتا ہوں کہ مذہبی زندگی میں عمدہ عمدہ چیزوں کی بہت سی امیدیں ہوتی ہیں، اور ایسی چیزوں کی ہوتی ہیں جو ہم کو پورا پورا کر سکتی ہیں، بلاشبہ امید کے اثر سے انسان کی زندگی نہایت شیریں ہو جاتی ہے۔

اگر وہ موجودہ حالت سے خوش نہیں رہتا تو اس پر صبر تو ضرور آجاتا ہے۔
مگر مذہبی امیدیں اس سے بھی زیادہ فائدہ مند ہیں۔ کیونکہ ان میں عقل کے علاوہ مذہبی اعتقاد کی بھی نہایت قوت ہوتی ہے۔ مذہبی امید گویا مردہ کو زندہ کردیتی ہے۔

میں ہمیشہ خدا کو اپنے سامنے دیکھتا ہوں۔ وہ میری دائیں طرف ہے اسی لئے میں گھبراتا نہیں۔ میرا دل خوش ہے۔ میرا گوشت بھی اسی امید میں رہے گا کہ تو میری روح کو جہنم میں نہ ڈالے! تو اپنی چیز کو خراب ہوتے ہوئے نہ دیکھے گا۔ تو ہی مجھ کو زندگی کے طریق دکھلائے گا! تیری ہی حضور میں خوشی کا کمال ہے! تیری ہی دائیں طرف ہمیشہ کی خوشی ہے! آمین!!

۲۲- اُمید کی خوشی

اے آسمان پر بھورے بادلوں میں بجلی کی طرح چمکنے والی دھنک! اے آسمان کے تارو، تمہاری خوش نما چمک! اے بلند پہاڑوں کی آسمان سے باتیں کرنے والی دھندلی چوٹیو! اے پہاڑ کے عالی شان درختو! اے اونچے اونچے ٹیلوں کے دلکش بیل بوٹو! تم بہ نسبت ہمارے پاس کے درختوں اور سرسبز کھیتوں اور لہراتی ہوئی نہروں کے کیوں زیادہ خوشنما معلوم ہوتے ہو؟ اس لئے کہ ہم سے بہت دور ہو۔ اس دوری ہی نے تم کو یہ خوبصورتی بخشی ہے۔ اس وجہ ہی سے تمہارا نیلا رنگ ہماری آنکھ کو بھایا ہے۔ تو ہماری زندگی میں بھی جو چیز بہت دور ہے۔ وہی ہم کو زیادہ خوش کرنے والی ہے۔

وہ چیز کیا ہے؟ کیا عقل ہے جس کو سب، سب سے اعلیٰ سمجھتے ہیں؟ کیا وہ ہم کو آئندہ کی خوشی کا یقین دلا سکتی ہے؟ ہرگز نہیں! اس کا میدان تو نہایت تنگ ہے۔ بڑی دوڑ دھوپ کرے تو نیچر تک اس کی رسائی ہے۔ جو سب کے سامنے ہے۔

او نورانی چہرے والے یقین کی اکلوتی بیٹی امید! یہ خدائی روشنی تیرے ہی ساتھ ہے! تو ہی ہماری مصیبت کے وقتوں میں ہم کو تسلی دیتی ہے! تو ہی ہمارے آڑے وقتوں میں ہماری مدد کرتی ہے! تیرے ہی بدولت نہایت نہایت دور دراز خوشیاں پاس نظر آتی ہیں۔ تیرے ہی سہارے سے

زندگی کی مشکل مشکل گھاٹیاں ہم طے کرتے ہیں تیرے ہی سبب سے ہمارے خوابیدہ خیال جاگتے ہیں۔ تیری ہی برکت سے خوشی، خوشی کے لئے نام آوری، نام آوری کے لیئے بہادری، بہادری کے لئے فیاضی، فیاضی کے لیئے محبت، محبت کے لئے نیکی، تیار رہے ہے! انسان کی تمام خوبیاں اور ساری نیکیاں تیری ہی تابع اور تیری ہی فرماں بردار ہیں!

وہ پہلا گنہگار انسان جب شیطان کے جنگل میں پھنسا، اور تمام نیکیوں نے اس کو چھوڑا، اور تمام بدیوں نے اس کو گھیرا، تو صرف تو ہی اس کے ساتھ رہی، تو ہی نے اس نا امید کو نا امید ہونے نہیں دیا، تو ہی نے اس موت میں پھنسے ہوئے دل کو مرنے نہیں دیا۔ تو ہی نے اس کو اس ذلت سے نکالا، اور پھر اسی کو اس اعلیٰ درجہ پر پہونچایا۔ جہاں کہ فرشتوں نے اس کو سجدہ کیا تھا۔

اس نیک نبی کو جس نے سیکڑوں برس اپنی قوم کے ہاتھ سے مصیبت اٹھائی اور مار پیٹ سہی، تیرا ہی خوبصورت چہرہ تسلی دینے والا تھا۔ وہ پہلا ناخدا، جبکہ طوفان کی موجوں میں بہا جاتا تھا، اور بجز مایوسی کے اور کچھ نظر نہیں آتا تھا۔ تو تو ہی اس طوفان میں اس کی کشتی کھینے والی اور اس کا بیڑا پار لگانے والی تھی۔ تیرے ہی نام سے جودی پہاڑ کی مبارک چوٹی کو عزت ہے۔ زیتون کی ہری ٹہنی کو، جو وفادار کبوتر کی چونچ میں وصل کے پیغام کی طرح پہونچی، جو کچھ برکت ہے تیری ہی بدولت ہے۔ اے آسمانوں کی روشنی! اور اے نا امید دلوں کی تسلی امید۔!

تیرے ہی شاداب اور سرسبز باغ سے ہر ایک محنت کا پھل پاتا ہے. تیرے ہی پاس ہر درد کی دوا ہے. تجھی سے ہر ایک رنج میں آسودگی ہے عقل کے ویران جنگلوں میں بھٹکتے بھٹکتے تھکا ہوا مسافر تیرے ہی گھنے باغ کے سرسبز درختوں کے سایہ کو ڈھونڈتا ہے۔ وہاں کی ٹھنڈی ہوا، خوش الحان جانوروں کے راگ، بہتی نہروں کی لہریں، اس کے دل کو راحت دیتی ہیں، اس کے مرے ہوئے خیالات کو پھر زندہ کرتی ہیں۔ تمام فکریں دل سے دور ہوتی ہیں، اور دور دراز زمانہ کی خیالی خوشیاں سب آموجود ہوتی ہیں۔

دیکھ! نادان بے بس بچہ گہوارہ میں سوتا ہے، اس کی مصیبت زدہ ماں اپنے دھندے میں لگی ہوئی ہے۔ اور اس گہوارہ کی ڈوری بھی ہلاتی جاتی ہے۔ ہاتھ کام میں اور دل بچہ میں ہے، اور زبان سے اس کو یوں لوری دیتی ہے۔

سورہ! میرے بچے سورہ!! اے اپنے باپ کی مورت اور میرے دل کی ٹھنڈک، سورہ! اے میرے دل کی کونپل سورہ! بڑھ! اور پھل پھول! تجھ پر کبھی خزاں نہ آنے پاوے! تیری ٹہنی میں کوئی خار کبھی نہ پھوٹے! کوئی کٹھن گھڑی تجھ کو نہ آوے! کوئی مصیبت جو تیرے ماں باپ نے بھگتی تو نہ دیکھے! سورہ! میرے بچے سورہ! میری آنکھوں کے نور اور میرے دل کے سرور، سورہ! تیرا مکھڑا چاند سے بھی زیادہ روشن ہوگا! تیری خصلت تیرے باپ سے بھی اچھی

ہوگی! تیری شہرت، تیری لیاقت، تیری محبت جو تو ہم سے کرے گا۔ آخرکار ہمارے دل کو تسلی دیں گی! تیری ہنسی ہمارے اندھیرے گھر کا اجالا ہوگی! تیری پیاری پیاری باتیں ہمارے غم کو دور کریں گی۔! تیری آواز ہمارے لئے خوش آیند راگنیاں ہوں گی! اسورہ میرے بچے اسورہ! اے ہماری امیدوں کے پودے اسورہ! بولو! جب اس دنیا میں ہم تم سے جدا ہو جاویں گے تو تم کیا کرو گے؟ تم ہماری بے جان لاش کے پاس کھڑے ہوگے! تم پوچھو گے اور ہم کچھ نہ بولیں گے، تم روؤ گے اور ہم کچھ رحم نہ کریں گے۔ اے میرے پیارے رونے والے! تم ہمارے لئے ڈھیر۔ آگرہ ہماری روح کو خوش کرو گے، آہ! ہم نہ ہوں گے اور تم ہماری یادگاری میں آنسو بہاؤ گے! اپنی ماں کا محبت بھرا چہرہ، اپنے باپ کی نورانی صورت یاد کرو گے۔ آہ! ہم کو یہی رنج ہے کہ اس وقت ہماری محبت یاد کر کر تم رنجیدہ ہوگے! اسورہ! میرے بچے! اسورہ! سورہ میرے پالے! اسورہ!!

یہ امیدوں کی خوشیاں ماں کو اس وقت تھیں جبکہ بچہ غوں غاں بھی نہیں کر سکتا تھا۔ مگر جب وہ ذرا اور بڑا ہوا، اور معصوم ہنسی سے اپنی ماں کے دل کو شاد کرنے لگا اور "اماں! اماں!" کہنا سیکھا، اس کی پیاری آواز ادھورے لفظوں میں اس کی ماں کے کان میں پہونچنے لگی، آنسوؤں سے

اپنی ماں کی آتش محبت کو بھڑکانے کے قابل ہوا، پھر مکتب سے اس کو سروکار پڑا۔ رات کو اپنی ماں کے سامنے دن کا پڑھا ہوا سبق غمزدہ دل سے سنانے لگا، اور جبکہ وہ تاروں کی چھاؤں میں اٹھ کر ہاتھ منہ دھو کر اپنے ماں باپ کے ساتھ صبح کی نماز میں کھڑا ہونے لگا، اور اپنے بے گناہ دل، بے گناہ زبان سے، بے ریا خیال سے خدا کا نام پکارنے لگا، تو امید کی خوشیاں اور کس قدر زیادہ ہو گئیں۔ اس کے ماں باپ اس معصوم سینہ سے سچی ہمدردی دیکھ کر کتنے خوش ہوتے ہیں! او ہماری پیاری امید! تو ہی ہے جو مہد سے لحد تک ہمارے ساتھ رہتی ہے۔

دیکھو! وہ بڈھا ناآنکھوں سے اندھا، اپنے گھر میں بیٹھا روتا ہے۔ اس کا پیارا بیٹا بچھڑوں کے ریوڑ میں سے غائب ہو گیا ہے۔ وہ اس کو ڈھونڈتا ہے، پر وہ نہیں ملتا، مایوس ہے، پر امید نہیں ٹوٹی، لو کھجرا [illegible] اٹھا سکتا۔ دیکھتا ہے، پر ملنے سے نا امید نہیں، فاقوں سے خشک ہے، غم سے زار و نزار ہے، روتے روتے آنکھیں سفید ہو گئی ہیں۔ کوئی خوشی اس کے ساتھ نہیں ہے، مگر صرف ایک امید ہے، جس نے اس کو وصل کی امید میں زندہ، اور اس کے خیال میں خوش رکھا ہے۔

دیکھو! وہ بے گناہ قیدی، اندھیرے کنوئیں میں، سات تہ خانوں میں بند ہے۔ اس کا سورج کا سا چمکنے والا چہرہ زرد ہے، بے یار و دیار، غیر قوم، غیر مذہب کے لوگوں کے ہاتھ میں قید ہے۔ بڈھے باپ کا غم

اس کی روح کو صدمہ پہونچاتا ہے۔ عزیز بھائی کی جدائی اس کے
دل کو غمگین رکھتی ہے۔ قید خانہ کی مصیبت" اس کی تنہائی اس گھر کا
اندھیرا،" اور اس پر اپنی بے گناہی کا خیال،" اس کو نہایت ہی رنجیدہ
رکھتا ہے۔ اس وقت کوئی اس کا ساتھی نہیں ہے۔ مگر اے ہمیشہ زندہ
رہنے والی امید! تجھی میں اس کی خوشی ہے۔

وہ دلاور سپاہی لڑائی کے میدان میں کھڑا ہے۔ کوچ پر کوچ
کرتے کرتے تھک گیا ہے۔ ہزاروں خطرے درپیش ہیں، مگر سب میں
تقویت تجھی سے ہے۔ لڑائی کے میدان میں، جبکہ بہادروں کی صفیں چپ
چاپ کھڑی ہوتی ہیں۔ اور لڑائی کا میدان ایک سنسان عالم ہوتا ہے۔
دلوں میں عجب قسم کی خوف ملی ہوئی جرأت ہوتی ہے" اور جبکہ لڑائی کا وقت
آتا ہے۔ اور لڑائی کے بگل کی آواز بہادر سپاہی کے کان میں پہونچتی
ہے" اور وہ آنکھ اٹھا کر نہایت بہادری سے بالکل بے خوف ہو کر لڑائی
کے میدان کو دیکھتا ہے،" اور جبکہ بجلی سی چمکنے والی تلواریں اور سنگینیں اس
کی نظر کے سامنے ہوتی ہیں" اور بادل کی سی کڑکنے والی،" اور آتشیں پہاڑ
کی سی آگ برسانے والی توپوں کی آواز سنتا ہے۔ اور جبکہ اپنے ساتھی
کو خون میں لتھڑا ہوا،" زمین پر پڑا ہوا دیکھتا ہے" تو اے بہادروں کے
قوت بازو،" اور اے بہادری کی ماں! تیرے ہی سبب سے فتحمندی کا
خیال اس کے دل کو تقویت دیتا ہے۔ اس کا کان نقارہ میں سے
فیروزی کی نعمتوں کی آواز سنتا ہے۔

وہ قومی بھلائی کا پیاسا اپنی قوم کی بھلائی کی فکر کرتا ہے۔ دن رات اپنے دل کو جلاتا ہے۔ ہر وقت بھلائی کی تدبیریں ڈھونڈتا ہے۔ ان کی تلاش میں دور دراز کا سفر اختیار کرتا ہے۔ یگانوں بیگانوں سے ملتا ہے۔ ہر ایک کی بول چال میں اپنا مطلب ڈھونڈتا ہے۔ مشکل کے وقت ایک بڑی مایوسی سے مدد مانگتا ہے۔ جن کی بھلائی چاہتا ہے انہیں کو دشمن پاتا ہے۔ شہری وحشی بتاتے ہیں۔ دوست آشنا دیوانہ کہتے ہیں۔ عالم فاضل کفر کے فتووں کا ڈر دکھاتے ہیں۔ بھائی بند عزیز اقارب سمجھاتے ہیں۔ اور پھر یہ شعر پڑھ کر چپ ہو رہتے ہیں۔ ؎

وہ بھلا کس کی بات مانے ہیں
بھائی سید تو کچھ دوانے ہیں

ساتھی ساتھ دیتے ہیں، مگر ہاں ہاں کر کر، محنت اور دل سوزی سے دور رہ کر بہت سی ہمدردی کرتے ہیں، ہر کوٹھی کٹھلے سے الگ کر کر دل ہر وقت بیقرار ہے۔ کسی کو اپنا سا نہیں پاتا، کسی پر دل نہیں ٹھہرتا، مگر اے بے قرار دلوں کی راحت، اور اے شکستہ خاطروں کی تقویت! تو ہی ہماری کٹھن منزلوں کی ساتھی ہے۔ تیری ہی تقویت سے ہم اپنی منزل مقصود تک پہونچیں گے۔ تیرے ہی سبب گوہر مراد کو پاویں گے۔ اور ہمارے دل کی عزیز اور ہمارے پیارے "مہدی" کی پیاری امید! تو ہمیشہ ہمارے دل کی تسلی رہ۔

اے ہمیشہ زندہ رہنے والی امید! جبکہ زندگانی کا چراغ ٹمٹماتا ہے اور دنیاوی حیات کا آفتاب لب بام ہوتا ہے، ہاتھ پاؤں میں

گرمی نہیں رہتی، رنگ فق ہو جاتا ہے، منہ پر مردنی چھا جاتی ہے، ہوا ہوا میں، پانی پانی میں، مٹی مٹی ملنے کو ہوتی ہے، تو تیرے ہی سہارے سے وہ کٹھن گھڑی آسان ہوتی ہے۔ اس وقت اس زرد چہرے، اور آہستہ آہستہ ہلتے ہونٹوں، اور بے خیال بند ہوتی آنکھوں، اور غفلت کے دریا میں ڈوبتے ہوئے دل کو تیری یادگاری ہوتی ہے۔ تیرا نورانی چہرہ دکھائی دیتا ہے۔ تیری صدا کان میں آتی ہے۔ اور ایک نئی روح اور تازہ خوشی حاصل ہوتی ہے، اور ایک نئی لازوال زندگی کی، جس میں ایک ہمیشہ رہنے والی خوشی ہوگی امید ہوتی ہے۔

یہ تکلیف کا وقت تیرے سبب سے ہمارے لئے موسم بہار کی آمد آمد کا زمانہ ہو جاتا ہے۔ اس کی لازوال آنے والی خوشی کی امید تمام دنیاوی رنجوں اور جسمانی تکلیفوں کو بھلا دیتی ہے، اور غم کی شام کو خوشی کی صبح سے بدل دیتی ہے، گو کہ موت ہر دم جتاتی ہے کہ مرنا بہت خوفناک چیز ہے۔

ہماری آنکھوں سے چھپی ہوئی دوسری دنیا میں، جس میں ہم کو ہمیشہ رہنا ہے، جہاں سورج کی کرن اور زمانہ کی لہر بھی نہیں پہونچتی، تیری راہ تین چیزوں سے طے ہوتی ہے۔ ایمان کے توشے، اور امید کے ہادی، اور موت کی سواری سے۔ مگر ان سب میں جس کو سب سے زیادہ قوت ہے، وہ ایمان کی خوبصورت بیٹی ہے جس کا پیارا نام امید ہے۔

لوگ کہتے ہیں کہ بے یقینوں کو موت کی کٹھن گھڑی میں کچھ امید نہیں ہوتی۔ مگر میں دیکھتا ہوں کہ تیری بادشاہت وہاں بھی ہے۔ قیامت پر یقین نہ لانے والا سمجھتا ہے کہ تمام زندگی کی تکلیفوں کا اب خاتمہ ہے اور پھر کسی تکلیف کے ہونے کی توقع نہیں ہے۔ وہ اپنے اس بے تکلیف آنے والے زمانہ کی امید میں نہایت بردباری سے، اور رنجوں کے زمانہ کے اخیر ہونے کی خوشی میں نہایت بشاشت سے یہ شعر پڑھتا ہوا جان دیتا ہے۔

بقدر ہر سکوں راحت بود بنگر تفاوت را
دویدن، رفتن، استادن، نشستن، خفتن و مردن

اُن میں قاعدے کا کہاں پتہ، اور انضباط کا کیا مذکور، اور قاعدہ اور انضباط
بھی کیسا! کہ دنیا کی ابتدا سے لے کر آج کی گھڑی تک تو اس
میں رتی برابر فرق پڑا نہیں۔

کشمیر کی ریب ایسی ریاست ہے جسکی آزادی الہی حد
میں نہیں ہو گا ہے۔ لوگ گمراہ ہوئے ہیں اور اُن کی سوچنے
کا طریقہ بالکل تباہ کن ہے۔ لوگوں کو زیر کتاب کا پورا
مطالعہ کرنا چاہیے۔ یہ کتاب سو فیصد کا نصیحت آموز ہے

۲۵۔ سراب حیات

صبح ہوتی ہے شام ہوتی ہے عمر یوں ہی تمام ہوتی ہے

کس خیال میں ہو آج آپ کی طبیعت کچھ "متفکر" معلوم ہوتی ہے؟

نہیں کوئی بات نہیں ہے یوں ہی سست ہے۔ آدمی کو کبھی کچھ خیال ہوتے ہیں کبھی کچھ۔ انہیں خیالات سے کبھی آپ ہی آپ خوش ہوتا ہے کبھی آپ ہی متفکر ہوتا ہے۔

بھلا کہئے تو سہی کن خیالات نے آپ کو متفکر کیا ہے ہم بھی تو سنیں۔

چند روز ہوئے کہ ایک گھنٹہ میں نے اپنے کمرے میں لگایا ہے۔ اس کا لنگر ٹوٹ گیا تھا۔ وہ بند تھا۔ نہ چلتا تھا۔ نہ آواز دیتا تھا۔ ایک دوست نے مہربانی سے اس کو بنا دیا وہ چلنے لگا اور آواز دینے لگا۔ میں دیکھتا ہوں کہ وہ دن رات چلتا ہے۔ ایک سے اپنا دورہ شروع کرتا ہے اور بارہ پر ختم کر دیتا ہے۔ اس کی ایک الٹ پھیر میں دن رات ختم ہو جاتا ہے۔ جب ہم خیال کرتے ہیں کہ ہم نے کیا کیا تو معلوم ہوتا ہے کہ کچھ نہیں یہی دھن کسی دن سے مجھے لگی ہوئی تھی۔ اور اسی خیال میں غلطاں پیچاں تھا کہ یکایک ہمارے دوست بادری رجب علی صاحب نے ایک کتاب بھیجی جس کے سرے پر لکھا تھا "سراب حیات" میں بہت خوش ہوا اور سمجھا کہ شاید اس سے کچھ عقدہ حل ہو گا۔

یہ کتاب دراصل انگریزی میں ہے اور "جالنس" نے بڑی فصاحت و بلاغت سے لکھی ہے اس کا ترجمہ پنڈت شمبھر ناتھ صاحب نے کچھ کمی بیشی کے ساتھ نہایت قابلیت سے اردو زبان میں کیا ہے۔

اس کتاب میں مصنف نے نہایت لائق اور مشہور اور عقلمند اور دولتمند اور فصیح و ظریف و شاعر فیاض و بخیل آدمیوں کا جو ہمارے زمانہ سے تھوڑے ہی دن پہلے اسی دنیا میں موجود تھے ذکر کیا ہے اور پھر دکھایا ہے کہ کس حسرت و افسوس سے اس دنیا سے گئے۔ تمام مال و دولت چھوڑ گئے۔ نہ وہ عقلمندی کام آئی۔ اور نہ وہ متاع دنیا۔ زبان حال سے یوں کہتے کہتے مر گئے سہ

کس لئے آئے تھے کیا ہم کر چلے
تہمتیں چند اپنے ذمہ دھر چلے

اس کتاب نے بعوض سلجھانے کے میرے خیالات کو اور الجھا دیا۔ اور یہ سوال دل میں پیدا ہوا کہ "کس لئے آئے تھے"؟ اسی سوچ میں تھا کہ میں نے اپنے کمرے کا دروازہ کھولا۔ ایک خوش نما ندی اور سرسبز درخت اور شاداب کھیتی پر میری نظر پڑی میں نے دیکھا کہ ندی کا پانی بہا چلا آتا ہے۔ پچھلا آتا ہے اور اگلا چلا جاتا ہے۔ درختوں کو میں نے دیکھا کہ پرانے جاتے اور نئے آتے ہیں۔ پکی کھیتی کاٹی جاتی ہے اور نئی بوئی جاتی ہے۔ یہی آواگون لگ رہا ہے۔ یہ کس لئے آئے تھے اور کس لئے گئے؟ کیا یہ بھی کچھ حسرتیں

بے گئے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ مگر میں نے غور کیا کہ شاید یہ مسئلہ کہ
وہ کس لئے آئے اور کیا کر چلے "متحرک جانداروں سے متعلق ہوگا
میں نے سب کی حالت پر اپنا خیال دوڑایا۔ میں نے شیر کا خیال
کیا جو سب سے زیادہ خوبصورت۔ سب سے زیادہ شاندار سب
سے زیادہ شجاع۔ سب سے زیادہ غیور مگر سب میں موذی اور باآزار
مشہور ہے۔ جب اس کی مردہ لاش کا میں نے دھیان کیا تو دیکھا کہ
ایک بے حرکت لاشہ پھول کر پیٹ پھٹا ہوا انتڑیاں گیدڑوں کی کھائی
ہوئی۔ سنہری کھال خاک میں ملی ہوئی۔ گوشت گل کر زمین پر پڑا ہوا۔
ہڈیوں کا ڈھانچہ ہی ڈھانچہ تھا۔ اور غالباً وہ بھی چند میں سمجھا کہ یہ تو
اسی قسم کا جانور تھا جس قسم کے آدمیوں کا "سراب حیات" میں جانسن
نے ذکر کیا ہے۔ کسی اس قسم کے زندہ جانور کو دیکھو۔ اتنے میں کتے
کا مجھے خیال آیا میں سمجھا کہ سب جانوروں میں یہی خدا رسیدہ ہے۔
قناعت، محبت۔ رفاقت۔ دوستی۔ وفاداری اپنے مالک کی اطاعت
اور سب سے زیادہ کسر نفسی اس پر ختم ہے۔ سب دور دور کرتے ہیں۔
مثلاً مولوی تو نجس العین بتاتے ہیں۔ مگر یہ غریب سب کے سامنے
عاجزی و کسر نفسی سے دُم ہلاتا اور سر جھکاتا ہے۔ مگر جب وہ بھی
مرا تو ایک لاش بے حرکت تھا۔ نہ وہ دم کا ہلانا تھا نہ وہ سر کا جھکانا
تھا۔ نہ وہ رفاقت تھی نہ وہ اطاعت تھی۔ چند روز میں اسی طرح ہڈیوں
کا ڈھانچا تھا۔ منھ کھلا۔ جبڑا ننگا۔ دانت اور پسلیاں کھلی ہوئی۔ اور

ہزاروں چیونٹیاں اُس میں گھسی ہوئی۔ میں نہایت متعجب ہوا اور کہا کہ میاں انجام تو دونوں کا ایک سا ہی ہوا۔

میں نے کہا نہیں کسی مقدس جانور کو لو میں نے کبوتر کا خیال کیا۔ جو دنیا میں سب سے مقدس شمار ہوتا ہے۔ بھولی بھولی صورت پیاری پیاری باتیں۔ جورو خصم میں نہایت محبت۔ دونو کا سوشل برتاؤ نہایت میٹھا۔ تقدس میں بھی سب سے بڑھا ہوا نوح کے لئے زیتوں کی مبارک ٹہنی لانے والا مسیح کے لئے روح القدس بن کر آنے والا۔ مکہ معظمہ میں کعبہ کا طواف کرنے والا۔ تمام خانقاہوں کا مجاور ہو کر رہنے والا۔ اپنے پروں کی ہوا سے بیماروں کو شفا بخشنے والا تمام ہندوؤں اور بدھسٹ لوگوں کو جی کے بچاؤ کی ہدایت کرنیوالا مگر جب اس کا بھی انجام دیکھا تو اس سے زیادہ کچھ نہ پایا کہ پر نچے ہوئے کہیں پڑے ہیں۔ چونچ کہیں اور پنجے کہیں۔ چند روز سینہ کا ڈھانچہ پڑا ہے پھر وہ بھی نہیں۔

میں نے اپنے خیال کو انسان کی طرف پلٹا کہ یکایک میرے سامنے سلطان عبدالعزیز خاں کا ماجرا موجود ہوا۔ جو نہایت مشہور اور بہادر شخص تھا۔ لڑائیوں میں نہایت دلیری و دانائی سے لڑا تھا۔ پندرہ برس سے قسطنطنیہ کے تخت شاہی پر جلوس کرتا تھا۔ لوگ کہتے ہیں کہ نہایت فضول خرچ تھا۔ عورتوں پر بہت فریفتہ تھا۔ تین کشتیاں عورتوں کی بھری ہوئی اس کی حرم سرا میں تھیں، بلکہ میں

روپیہ کی کمی تھی۔ شاہی خزانہ خالی تھا۔ باغیوں سے سلطنت میں آفت برپا تھی۔ مگر اس نے کئی کروڑ روپیہ اپنے خزانہ میں عیاشی کے لئے چھپا رکھا تھا۔ اپنی پیاری جورو کی خوشی کے لئے ترکوں کی ولی عہدی کی پرانی رسم کو توڑنا چاہتا تھا اس جورو سے جو بیٹا تھا۔ اس کو ولی عہد بنانا تھا۔ اور ملک کی بربادی کا کچھ خیال نہ کر کے اس کام کے پورا کرنے کو ملک کے دشمن آدمیوں کو اپنا دوست بنایا تھا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ اپنے جرموں میں اسی کی سلطنت کے لوگوں نے اس پر یورش کی۔ تخت سے اتار دیا۔ اور محل سے نکال اک جھوٹے سے مکان میں قید کر دیا۔ سلطنت جانے کی حسرت نے اس کے دل کو بیتاب کر دیا۔ اور اپنے تئیں آپ مار مرا۔ میرے خیال نے جھٹ ہاتھ دوڑایا۔ پہلے تو ماتھے پر رکھا پھر نتھنوں کے سامنے لے گیا کہ شاید کچھ سانس چلتی ہو۔ سینہ کو ٹٹولا۔ ہاتھ کو دیکھا۔ پاؤں کو دیکھا۔ چاروں طرف غور کیا۔ بجز ایک لاش کے کچھ نہ پایا۔ سینہ پر کان لگایا کہ شاید وہ ہڈیاں اچھل رہی ہوں مگر کچھ پتہ نہ لگا۔ میں سمجھا کہ اب اس میں کچھ نہیں چند روز میں یہ گوشت بھی نہ ہوگا۔ صرف ہڈیوں کا ڈھانچا رہ جائے گا۔ اور چند روز بعد وہ بھی نہ ہوگا۔ مجھے جالنس کی "شراب حیات" یاد آئی۔ اور سمجھا کہ دنیا کی حسرت میں مرا۔ اسی لئے اس کا یہ حال ہوا۔

مجھ کو اشتیاق ہوا کہ کسی بڑے خدا رسیدہ دنیا کی طرف سے بر گشتہ مرے ہوئے کا حال دیکھوں۔ پنجاب کا ایک نہایت متبرک

شخص میری آنکھوں میں بھر گیا۔ اس کے دیکھنے سے میں بہت خوش ہوا۔ خدا کے سوا اور کچھ کلام نہ تھا۔ عبادت کے سوا اور کچھ کام نہ تھا دنیا اور اس کا عیش محض بے حقیقت تھا۔ جو لو تھی وہ خدا سے اور عقبیٰ سے لگی ہوئی تھی۔ اتفاق سے ان کا بھی آخری وقت آ پہنچا اپنی اولی منزل کی انہوں نے وصیت کی اور اپنے دوستوں کو نصیحت نہایت شاداں و فرحاں سفر کی تیاری کی اور بغیر کسی ارمان و حسرت کے جان دی۔ میرے خیال نے جھٹ ہاتھ بڑھایا۔ ماتھے پر رکھا۔ نتھنوں کے سامنے کیا۔ دل ٹٹولا۔ سینہ ٹٹولا۔ ہاتھ دیکھا۔ پاؤں دیکھا۔ کچھ نہ تھا۔ سینہ پر ٹکٹکی باندھی۔ کہ اس کے اندر سے ضرور کچھ روشنی جھلکتی ہوگی مگر کچھ نہ تھا۔ میں گھبرایا اور بے اختیار بول اٹھا کہ اجی حضرت کچھ بولو تو سہی۔ وہاں کیا تھا۔ سانس بھی نہ تھی۔ میں نے کہا یہ تو ویسا ہی معاملہ ہو گیا۔ جیسا کہ ان پہلوں کے ساتھ ہوا تھا دنیا کی حسرت لے جانے اور عبادت کے شوق میں مر جانے میں تو اب تک کچھ فرق نہیں دکھائی دیا۔

اتنے میں لوگ ان کی تجہیز و تکفین کرنے لگے۔ خانقاہ میں اگلے سجادہ نشینوں کی قبروں کے برابر قبر کھودنے لگے۔ میں نے گھبرا کر کہا کہ دو چار دن رہنے تو دو۔ مجھے سمجھ تو لینے دو کہ یہ ماجرا کیا ہے۔ لوگوں نے کہا کہ دیوانہ ہوا ہے۔ مردوں کو کوئی رکھتا بھی ہے۔ تمام کھال بکس جائے گی۔ گوشت گل پڑے گا۔ ہڈیوں کا ڈھانچا نکل آوے گا۔

کوّے اور چیلیں منڈلانے لگیں گے۔ ہڈیوں کے ڈھانچے۔ سے لوگ ڈر کر بھاگنے لگیں گے۔" یہ سُن کر تو میں ششدر رہ گیا۔ تمام اگلے لاشے میری آنکھوں میں پھر گئے۔ میں نے کہا میاں اور سب کا بھی تو یہی حال ہوا تھا۔ کیا ہی بات سچ ہے ؎

چو آہنگ رفتن کند جان پاک
چہ بر تخت مردن چہ بر روئے خاک

میں نہایت متردّد و متفکّر حیران و ششدر وہاں سے اٹھا اور دل بہلانے کے لئے اپنے باغ میں گیا جو ایک بہت بڑا باغ تھا۔ اور جوانی اور ولولہ کے زمانہ میں میں نے اُس کو از سر نو نہایت خوبصورت و خوشنما آراستہ کیا تھا اور وہاں اکثر دوستوں کا اور بڑے بڑے نامی اور باکمال لوگوں کا مجمع ہوتا تھا۔ غالبؔ کی دلکش و محبت آمیز بزرگانہ باتوں سے، آزردہ کی دلچسپ دلربا فصاحت سے، شیفتہ کی متین و نیم خندہ زن وضع سے، صہبائی جاں نواز کے میخانۂ محبت سے دل شاد شاد رہتا تھا۔ ادھر ادھر پھر رہا تھا۔ ایک چمن میں پہنچا جس کی نئی کھدائی ہوئی تھی مٹی میں ایک ہڈی دکھائی دی جس کو میں بکرے کی سری سمجھا۔ میں نے ٹھوکر مار کر پرے پھینک دیا۔ جب وہ نکلی تو بکرے کی سری نہ تھی بلکہ آدمی کی کھوپڑی تھی۔ میں نے اپنے دل سے کہا کہ ایک دن اسی طرح کوئی شخص میری کھوپڑی کو بھی ٹھوکر مارے گا۔ میں نے دوڑ کر اسے اٹھا لیا اور دیکھا کہ صرف ہڈیاں جڑی رہ گئی ہیں۔

پیشانی کی ہڈی پر خط خط ہیں۔ شاید وہی نوشتۂ تقدیر ہو۔ پڑھی نہیں گئی۔ آنکھوں کی جگہ ایک گڑھا اور حلقہ تھا۔ انگلی ڈالو تو کچھ نہیں۔ ناک کی خوبصورتی بالکل نہ تھی۔ ایک شکستہ تھوڑی سی اونچی نہایت بدنما ہڈی کا نشان تھا اور اس کا سوراخ نہایت ہی بڑا معلوم ہوتا تھا دانت جن کو موتی اور اولوں کی باڑھ کہتے تھے ایسے ہیبت ناک دکھائی دیتے تھے کہ دل کانپتا تھا۔ میں نے اپنی بے ادبی کی جو نادانستہ ہوئی معافی چاہی اور پوچھا کہ تم کون ہو؟ کیا مذہب تھا۔ عالم تھے فقیر تھے۔ دنیا کی حسرت میں مرے یا خدا کی عبادت میں۔ ہر چند پوچھا، کچھ جواب نہیں ملا۔ پھر میں اس کو الٹ پلٹ کر دیکھنے لگا کہ شاید کچھ نشان بھلائی یا برائی کا ملے۔ کچھ نہ ملا۔ ایک بڈھا باغبان میری ان سب باتوں کو دیکھ رہا تھا۔ اس نے کہا کہ میاں، کیا دیکھتے ہو۔ اچھے بروں کا، گیدڑ کا بھیڑیے کا، مرے پر سب کا ایک حال ہو جاتا ہے۔ میں سخت متعجب ہوا اور جانسن کی "سراب حیات"، کو یاد کیا۔ پھر اس نے کیا کہا۔؟

میرے دوست نے کہا کہ تمہارے خیال بھی نہایت خام ہیں۔ اور تمہارے متفکر ہونے پر بھی نہایت افسوس ہے۔ تم اس مٹی کے ڈھیر اور سڑنے والے گوشت، اور گلنے والی ہڈیوں میں کیا ڈھونڈھتے تھے۔ جو چیز دیکھنے کی تھی وہ تو اس میں تھی ہی نہیں۔

میں نے پوچھا کہ وہ پھر کہاں تھی؟ اس نے کہا کہ معلوم نہیں، پھر

پوچھا کہ کیسی تھی؟ بولا کہ معلوم نہیں۔ پھر پوچھا کہ دکھائی دیتی تھی؟
کہا نہیں۔ پھر پوچھا کہ کہاں گئی؟ کہا معلوم نہیں۔

اس جواب سوال سے میں اور بھی متحیر ہوا کہ جس چیز کا کسی طرح
پر علم نہیں۔ اس کی نسبت کہتا ہے کہ تھی۔ بولا کہ خدا نے کہا ہے میں
نے کہا سچ۔ ولیکن لیطمئن قلبی۔ یہ سنا اور سنکر خاموش ہو رہا میں
نے کہا یہ سب تمہارے خیالات ہیں کہ وہ شخص دنیا کی حسرت میں مرا
اور وہ شخص خدا کی عبادت میں مرے پر یہ سب برابر ہیں جو بات سچ
ہے وہ آپس کی ہمدردی، قومی اعانت، قومی بھلائی۔ جب کہ ہماری
قوم کا دنیا میں یہ حال ہے کہ ذلت و خواری۔ نکبت و جہالت میں مبتلا
ہے تو اگر کوئی دنیا کی حسرت میں مر کر جہنم میں گیا تو ہماری جوتی سے
اور عبادت کر کے بہشت میں گیا تو ہماری بلا سے۔ ان کا کیا رونا ہے۔
جیتوں کو روؤ جو مُردوں سے بدتر ہیں۔

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے

خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

(اقبالؒ)

مضامین سرسید

گنہگاروں میں شامل ہیں گناہوں سے نہیں واقف
سزا کو جانتے ہیں ہم خدا جانے خطا کیا ہے